دراصل ہر مذہب میں بعض ایسی مشترک اصولی اور بنیادی باتیں ملتی ہیں، جن کی وجہ سے وحدتِ ادیان کا تصور پیدا ہوتا ہے، لیکن ہر مذہب کی شریعت اور منہاج کے مختلف ہونے کی وجہ سے وحدتِ ادیان کا یہ تصور ختم ہو جاتا ہے، جس سے غالباً ہمارے فاضل مصنف کو بھی اتفاق ہے، مصنف اسلام کے بنیادی تصورات میں توحید آخرت اور یتامیٰ و مساکین کی امداد کا ذکر کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں، کہ بنیادی چیز خدا کی ہستی پر ایمان کامل اور اسکی عبادت ہے، لیکن یہ محض کلمہ کا ایک جز لا الٰہ الا اللہ ہے، مگر وہ اسکے دوسرے جز محمد رسول اللہ اور اسلام کے تصور رسالت کا ذکر نہیں کرتے جب کہ انھیں یہ تسلیم ہے کہ محمدؐ آخری اور مکمل دین لائے، گذشتہ جن قوموں نے انبیاءؑ کی تکذیب کی یا موجودہ دور کی جن قوموں کے بارہ میں قرآن مجید کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے، انھیں قطعیت کے ساتھ اہل کتاب قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔

مطالعات:- جلد اول، مرتبہ ڈاکٹر بدر الدین بٹ تقطیع متوسط، کاغذ بہتر کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۹۴ قیمت ۲۰ روپیہ پتہ (۱) ڈاکٹر بدر الدین بٹ کوئل، ہلوامہ، کشمیر (۲) مکتبہ علم و ادب بنڈ کراس روڈ سری نگر۔

یہ کتاب چھ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں عربی میں لفظ ادب کے تصور و مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے اور اس میں عہد بعہد کے تغیر کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اب ادب کا کیا مطلب سمجھا جاتا ہے، دوسرے میں اصلاً اندلس کی عربی شاعری میں منظر نگاری کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، اور ضمناً عام عربی شاعری میں منظر نگاری کا بھی مختصر جائزہ بھی لیا ہے، آخر کے چار مضامین میں عربی زبان کے چار مشہور ادیبوں اور انشا پردازوں ابوحیان توحیدی، بدیع الزماں ہمدانی، صاحب ابن عباد اور قاضی محسن تنوخی کے حالات و کمالات بیان کئے گئے ہیں، مصنف نے ان چاروں مصنفین کی کتابوں کا تعارف کرا کے ان کے طرز نگارش اور اسلوب کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں اور ان کے ادبی درجہ و مرتبہ پر بھی بحث کی ہے، انھوں نے اردو میں عربی زبان و ادب اور اس کے مشہور ادیبوں پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اس کی پہلی کڑی ہے، امید ہے، عربی زبان و ادب کے طلبہ و شائقین میں یہ سلسلہ مقبول ہوگا، لیکن ابھی یہ مرتب کی پہلی پیش کش ہے، اس لیے زبان و بیان کی فروگذاشتوں کے علاوہ دوسری حیثیتوں سے بھی اس میں کو رکسر ہے، جو آئندہ مشق و ممارست کے بعد دور ہو جائے گی۔

"ض"

جلد ۱۳۸ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۶ء عدد ۶

مضامین

مقالات

شذرات

دار المصنفین شبلی اکاڈمی کی تاسیس نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوئی، اس طرح یہ ادارہ اب بانوے سال گزار کر ترانویں عمر میں داخل ہو رہا ہے۔

اتنی مدت میں اس کی علمی شہرت چاردانگ عالم میں پہنچ چکی ہے، اس میں شک نہیں کہ اس کی ناموری میں اس کے ایثار پسند، خدمت گزار اور بلند پایہ مصنفوں کا نمایاں ترین حصہ ہے لیکن اس کے حصول میں اس کی مجلس انتظامیہ اور مجلس عاملہ کی ملک گیر تشکیل کو بھی بڑا دخل رہا، اس کی مجلس انتظامیہ کی صدارت کو نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی وزیر اعظم سابق ریاست حیدر آباد، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی وزیر امور مذہبی سابق ریاست حیدر آباد، اور ڈاکٹر سید محمود وزیر حکومت ہند کی باوقار شخصیتوں کی وجہ سے بڑی جلا پیدا ہوتی رہی۔

موجودہ دور میں اس کے صدر حیدر آباد کے شہزادہ مکرم جاہ ہیں، اس کی مجلس عاملہ کی صدارت کو مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبد الماجد دریابادی، اور مولانا ابوالحسن علی ندوی نے غیر معمولی رونق بخشی، مجلس انتظامیہ کے اراکین میں جسٹس کرامت حسین لکھنؤ، نواب علی حسن خان بھوپال، نواب ناظر یار جنگ حیدر آباد، ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریۂ ہند، جناب فخر الدین علی احمد سابق صدر جمہوریۂ ہند، نواب عبید الرحمٰن خان شیروانی پرو چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کرنل بشیر حسین زیدی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب حکیم عبد الحمید ہمدرد نگر نئی دہلی، اور دوسرے مشاہیر دار المصنفین کے علمی افق پر مہر و ماہ بن کر درخشاں اور تابندہ رہے، انھوں نے اس ادارہ کو ہر قسم کی علمی، مالی اور اخلاقی امداد پہونچائی۔

موجودہ اراکین میں ایک بہت ہی محبوب اور معزز نام جناب سیٹھ عبد العزیز انصاری کا ہے، جن کے ذکر خیر میں اس وقت قلم سے بے ساختہ یہ تحریر نکل رہی ہے، وہ اعظم گڈھ ضلع ہی کے رہنے والے ہیں، اہل قلم تو نہیں،

لیکن ذوق شعری بہت اچھا اور صاف ستھرا رکھتے ہیں، ممبئی میں ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرتے ہیں، وہاں دوسرے کاروباریوں نے ان سے زیادہ دولت حاصل کی لیکن انھوں نے جو عزت، وقعت اور منزلت حاصل کی، وہ کسی کو کم نصیب ہوئی، وہ اپنے حلقے کے حاتم طائی بنے رہے، ان کو اپنے عزیزوں، دوستوں، حاجتمندوں اور جاننے والوں کی مدد کرنے میں وہی لذت ملتی رہی، جو نوابوں اور رئیسوں کو اپنی محفل رقص و سرور میں ملتی رہی، انھوں نے اپنی ساری کمائی اپنے مہمانوں کی خاطر داری میں گنوائی، ان کے جو فیاضانہ دستر خوان سجاتے تو ان کے چمچوں اور پلیٹوں کی کھنکھناہٹ میں ان کو وہی نشاط حاصل ہوتا جو کسی میخانہ کے ایک میخوار کو اپنے شیشہ و ساغر میں ارغوانی اور گلابی شراب کو اچھلتے دیکھنے میں ہوتا ہے، ان کی سادگی میں رئیسانہ کر و فر دکھائی دیتا، ان کے دروازہ پر ان کے بچوں کی آمد و رفت کے لیے کئی موٹریں کھڑی رہتی ہیں لیکن وہ چند آنے پیسے دیکر بس ہی سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں، اگر کسی ماہر سنگتراش کو مہر و محبت، دلجوئی، دلداری، اور دلنوازی کا پیکر بنانے کو کہا جاتا تو اسمیں سیٹھ عبد العزیز انصاری ہی کی شبیہ نظر آتی۔

ان کو دار المصنفین سے بڑی محبت ہے، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے جلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے، یہاں آکر کہتے کہ اس کے مرغزاروں، سبزہ زاروں اور درختوں میں وہ بزرگ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، جنھوں نے اس زمین کے ایک ٹکڑے کو علم و فن کا لالہ زار بنا دیا ہے، دار المصنفین کے جلسوں میں ہی اس ادارے کو ہر طرح سے محفوظ رکھنے کی جو نصیحتیں کرتے رہے، وہ چاندی کے سکوں کی سیمیں آواز کی طرح اسکے اراکین کے کانوں میں برابر سامعہ نواز رہیں گی، ایک موقع پر جب دار المصنفین کو مالی اعانت کی ضرورت تھی تو اس کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ممبئی میں طلب کیا، اور اس کے اراکین کی جو خاطر تواضع کی تو ان کے واقعی حاتم طائی ہونے کا اندازہ ہوا، اپنی محبت میں دار المصنفین کے اراکین کو کسی سے مالی اعانت کی لب کشائی پر پابندی عائد کر رکھی تھی، وہ خود اپنے یہاں بڑی بڑی دعوتوں میں ممبئی کے اصحاب ثروت کو مدعو کرتے اور ان کو دار المصنفین کو نذرانے پیش کرنے پر آمادہ کرتے۔

وہ گذشتہ نومبر میں دارالمصنفین تشریف لائے، ان کو مریض، مضمحل اور پژمردہ دیکھ کر دکھ ہوا، ان کی شخصیت کے کنگورے پر ان کی خوبیوں کے چودھویں کے چاند کی چاندنی چھٹکی نظر نہیں آئی، دارالمصنفین کی عمارت کے سامنے کھڑے ہو کر بولے، اس نے ہم کو، ہمارے آباء و اجداد کو، ہمارے شہر کو اور ہمارے ملک کو بڑی عزت بخشی، یہ خاکسار کچھ دور کھڑا تھا، اپنے پاس بلا کر کہا کہ تمھارے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ تم نے اس کی عزت کو برقرار رکھا، پھر اپنے اردگرد کے لوگوں سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جس نے ان کو اذیت پہونچائی، اس نے مجھ کو اذیت دی۔

اسی روز دارالمصنفین میں انکے اعزاز میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ڈیہر کا کھانا تھا کھانا کھا کر اپنے فرزند ارجمند عزیزی ابو صالح کے سہارے اٹھے تو یہ راقم بھی ان کے پاس کھڑا تھا، اس وقت عزیزی ابو صالح کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ میری وصیت ہے کہ ان کو کسی قسم کی اذیت نہ پہونچنے پائے، اسی روز شام کو شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج میں ان کے لیے عصرانہ تھا، وہاں سے رخصت ہوئے تو کچھ لوگوں سے میری طرف ہاتھ اٹھا کر کہا کہ ان کو کوئی اذیت نہ پہونچے، وہ اعظم گڈھ سے رخصت ہو کر اپنے گاؤں چلے گئے، تو ایک روز اعظم گڈھ کی ایک معزز شخصیت نے آکر اس خاکسار سے کہا کہ وہ منشی جی کو رخصت کرنے کے لیے انکے گاؤں گئے تھے، تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ صباح الدین پر کوئی آنچ نہ آنے پائے، میری حقیر ذات ہی کیا، یہ گویا ان کی خواہش تھی کہ دارالمصنفین پر کوئی آنچ نہ آئے، ان کی ان محبت بھری باتوں کو یاد کر کے اپنی تمام تصنیفی زندگی کو ہیچ سمجھتا ہوں، اور ان کی محبت، شفقت، اور اخلاص کے بارے اپنے کو دبا پاتا ہوں، دارالمصنفین کی فضا میں ان کی یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

ع ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

مقالات

شاخت اور حدیث نبویؐ

از ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی، استاذ حدیث، ملک سعود یونیورسٹی ریاض مملکت سعودیہ

ترجمہ:- از حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دارالمصنفین

(۲)

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں فقہاء کی سرگرمیاں، شاخت کی نظر میں

شاخت لکھتے ہیں کہ نبی کریمؐ مدینہ میں ایک قانون ساز نبی کی حیثیت سے نمایاں ہوئے، اور گو آپ نے کسی قانون کو مکمل طور پر نافذ نہیں کیا لیکن مسلمانوں کے لیے دینی لحاظ سے اور منافقین کیلئے سیاسی طور پر ایسے احکام ضرور نافذ کیے جو ایک حد تک تشریع کی تعریف میں آتے ہیں[۱]، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

خلفاء راشدینؓ (۶۳۲ - ۶۶۱ ھ) امت اسلامیہ کے سیاسی راہنما تھے، اور یہ کہیں سے ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنے احکام اور فیصلوں میں مصدر اعلیٰ (ذات نبویؐ یا قرآن مجید) سے رہنمائی حاصل کی، بلکہ بڑی حد تک ان خلفاء کے عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ امت کے لیے خود ہی قانون ساز تھے[۲]، ان خلفاء راشدینؓ نے قضاۃ کو مقرر نہیں کیا انکے[۳] بعد اموی خلفاء نے یہ اہم قدم اٹھایا کہ انھوں نے اسلامی قضاۃ کو مقرر کیا۔ پہلی[۴] صدی ہجری کے آخر تک مخصوص لوگوں کو ہی عہدہ قضاء پر مامور کیا جاتا تھا، جن کی خصوصیت یہ ہوتی تھی، کہ وہ متقی و پرہیزگار ہوتے، اور ان کی یہ ذاتی خواہش

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا ڈکشنری آف اسلامک لا شاخت ص ۱۱ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۱۲ [۴] ایضاً ص ۲۳۔

ہوتی تھی کہ وہ لوگوں کے لیے اسلامی نظام زندگی کی راہوں کو ہموار کریں۔[1]

دوسری صدی ہجری تک بتدریج ان مخصوص متقیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ان کا آپس میں ربط بھی بڑھا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ کے چند باقاعدہ مکاتب فکر وجود میں آگئے۔[2]

فقہ کے یہ مکاتب، گو فکری اعتبار سے مختلف النوع تھے، اور ان میں سے ہر مکتب اپنے بعض اسلاف کی رایوں کی نمائندگی کرتا تھا، مگر وہ قانون کے ... بنیادی نظریہ میں متفق الخیال تھے، اور یہ بنیادی نظریہ "عمل" یا "امر متفق علیہ" کے اصطلاحی نام سے معروف تھا، اور اصلاً یہ نظریہ دو دائروں تک محدود تھا،

ایک تو یہ کہ ماضی کے واقعات کو دیکھنا اور ان میں غور و فکر کرنا، دوسرے عصری اور وقتی ماحول و مسائل کو مد نظر رکھنا، شاخت کے نظریہ کے مطابق پہلی صورت میں اس قانون کو سنت یا حدیث "اور عمل" کے لبادہ میں ظاہر کیا گیا۔[3]

سنت یا حدیث یا اسوۂ قابل تقلید پر عمل اور اس کے ساتھ بعض عصری تقاضوں کے تحت کچھ اور نظریات کا وجود کا یہ سلسلہ دوسری صدی ہجری کی ابتدائی دہائیوں سے شروع ہوا تو پھر یہ فقہاء کا خاص نظریہ بن گیا،[4] امر متفق علیہ سے یہی حقیقت حال مراد ہے، جس میں کسی بھی رائے کو ماضی کی کسی بڑی شخصیت کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہو۔

مثلاً کوفہ والوں نے سب سے پہلے اپنی رایوں اور نظریات کو ابراہیم نخعی سے منسوب کیا، بعد میں مدینہ والے بھی اس راہ پر گامزن ہوئے۔[5]

فقہ اسلامی کی نظری اساس کو وجود میں لانے کے لیے ماضی کے اوراق میں پسندیدہ رایوں کو تلاش کرنے کا یہ عمل صرف اسی حد تک محدود نہیں رہا کہ ان کو ماضی قریب کی چند شخصیتوں سے منسوب

---

[1] انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا شاخت ص ۲۶ [2] ایضاً ص ۲۸ [3] ایضاً ص ۳۰-۲۹ [4] ایضاً ص ۳۱۔

کر دیا جائے، بلکہ علماء نے یہ کوشش کی کہ اپنی رایوں کی تائید میں زیادہ سے زیادہ قدیم شخصیتوں بلکہ صحابہ کرامؓ کی جانب نسبت کا اظہار کیا جائے، چنانچہ کوفہ والوں نے اپنے اس عمل میں حضرت عبداللہؓ ابن مسعود کو شریک کر لیا۔[1]

شاخت نے اپنے ان نظریات و خیالات کے اظہار کے بعد یہ انکشاف کیا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں محدثین کے طبقہ کا وجود . . . در حقیقت، فقہ کے ان مذکورہ مختلف طبقات کے خلاف ایک ردعمل تھا، محدثین پر دین و اخلاق کا زیادہ اثر تھا،[2] اور ان کی نظر و فکر کا بنیادی مرکز یہ تھا کہ نبی کریمؐ سے ماخوذ "حدیثوں" کا حق یہ ہے کہ وہ فقہی حدیثوں پر غالب رہیں، اس مقصد کے تحت محدثین نے تفصیلی روایتوں یا حدیثوں کو وضع کیا، اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ روایتیں رسول اللہؐ کے اقوال و افعال ہیں یا پھر یہ تقریر رسول کی قسم سے ہیں، اور یہ ساری روایتیں ان تک غیر منقطع اسانید اور معتبر راویوں کی زبانی پہنچی ہیں، شاخت کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے ہمارے لیے یہ سخت دشوار ہے کہ فقہی حدیثوں میں سے کسی بھی حدیث کے متعلق یہ فیصلہ کریں کہ وہ صحیح اور معتبر ہے۔[3]

اس کے بعد شاخت لکھتے ہیں۔ کہ محدثین کے اس سخت موقف کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ کے سارے طبقات و مکاتب فکر ان کے سخت مخالف ہو گئے۔[4]

فقہاء و محدثین کی اس کشمکش کے تجزیہ میں ان کی رائے یہ ہے کہ چونکہ محدثین نے رسول اللہؐ کی شخصیت کو اپنا حلیف بنا لیا، اور انھوں نے اپنی روایات و نظریات کو زیادہ مہارت کے ساتھ پیش کیا اس لیے اس تصادم میں ان کی فتح یقینی تھی، فقہی مکاتب فکر کے سامنے حدیث نبوی کے اس حملہ کے مقابلہ کے لیے کوئی دفاعی لائن نہیں تھی، اس صورت میں ان فقہاء کے لیے ایک ہی بہتر شکل تھی،

---

[1] انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا شاخت ص ۳۴ [2] ایضاً ص ۴۴ [3] ایضاً ص ۴۲ [4] ایضاً

اور وہ یہ کہ اپنی بحثوں میں تفسیر و تشریح کے لیے حدیثوں سے کم سے کم درجہ میں استدلال کرتے، اور
اس میں رسول اللہ سے منسوب ایسی حدیثوں کا انتخاب کرتے جن سے ان کی ذاتی فقہی رایوں کی تائید
ہوتی نظر آتی۔

شاخت اس موقع پر یہ رائے بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر وضع احادیث کے عمل میں یہ فقہاء،
محدثین کے ساتھ اس طور پر شریک ہوتے کہ اپنے اقوال کو رسول اللہ سے منسوب کرتے تو وہ آغاز میں
ہی محدثین کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاتے۔[۱]

کتب احادیث میں جو متصل السند اسناد موجود ہیں، ان کے متعلق شاخت کی تحقیق یہ ہے
کہ یہ محض دروغ اور بے حیثیت ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ مکمل احادیث نبوی کا ذخیرہ دوسری یا
تیسری صدی ہجری میں پایا جاتا ہے، تو یہ تصور کیونکر ممکن ہے کہ اسناد کا وجود متن کے وجود سے پہلے ہو۔

شاخت کہتے ہیں کہ احادیث کی اسانید کا ایک بڑا حصہ ناقص ہے، اور یہ سب کو معلوم ہے
کہ اسانید تیسری صدی ہجری کے نصف ثانی میں مکمل شکل میں مرتب ہوئیں، ان اسانید سے زیادہ
اعتنا نہیں کیا گیا، بلکہ جو طبقہ اپنی رایوں کو متقدمین سے منسوب کرنا چاہتا وہ ان میں سے چند شخصیتوں
کا انتخاب کر لیتا اور پھر ان کو اسانید میں شامل کر دیتا۔[۲]

شاخت کی مذکورہ بالا رایوں کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، اور بعد میں ان تینوں حصوں
پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

۱- اول یہ کہ احادیث نبوی کے خلاف اصحاب فقہ کی جانب سے سخت مزاحمت ہوئی۔

۲- فقہی حدیثیں وضع ہوئیں، اور یہ اس طور پر کہ ذاتی یا مسلکی رایوں کو متقدمین بلکہ خود
رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا۔

۱۔ انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا ص ۳۶-۳۵ ۲۔

۳- احادیث کا سلسلہ اسانید وضع کردہ اور ناقص ہے۔

شاخت کے ان تینوں بنیادی اعتراضات کے جواب دینے سے پہلے ہم پھر اس حقیقت کی جانب
نشاندہی کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی ایک اصولی غلطی، ان کی ساری بحث کو غلط بناتی جاتی ہے،
مذکورہ بالا باتوں کا ربط ایک دوسرے سے ہے، اس لیے جب وہ ایک جگہ غلط نظریہ کو راہ دیتے ہیں
تو پھر وہ غلطی پر غلطی کا ارتکاب کرتے چلے جاتے ہیں اور جب وہ اپنے مطلوبہ نتائج تک نہیں پہونچتے تو پھر وہ
اپنی ہی دلیلوں سے صرف نظر کر کے اپنی مرضی و منشا کے مطابق نتائج اخذ کرتے ہیں، ان کو یہ بھی
پرواہ نہیں رہتی کہ نقل روایت میں خود ان کی تکذیب ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ متضاد اور متناقض
مثالوں کو ایک ہی جگہ پیش کر کے وہ عجیب و غریب نتائج کو مستنبط کرتے ہیں، ہم اپنی اس رائے کے
اثبات میں تفصیل سے آئندہ سطور میں بحث کریں گے، لیکن سب سے پہلے ہم تاریخی پس منظر میں شاخت
کے نظریات پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

قدیم فقہی مکاتب فکر اور ان کے مخالفین کے نشو و نما کا دور اور شاخت کی رائے،	شاخت کا دعویٰ ہے کہ امام شعبی متوفی ۱۱۰ھ کی زندگی میں فقہ اسلامی کا وجود نہیں تھا۔[۱]

حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۴۳ھ میں فقہاء کے مرتب و مدون کیے ہوئے لٹریچر میں فقہی جزئیات
کے علاوہ حدیث نبوی کے اعتراف اور اس کی بالادستی اور اس کی قدر و منزلت کی مثالیں موجود ہیں،[۲]
فقہ اسلامی کے سب سے بڑے امام ابو حنیفہ اور ان کے مسلک کا جو عملی اور نظری تعلق حدیث نبوی سے
ہے وہ معروف اور مشہور ہے،[۳] اور ان . . کا انتقال ۱۵۰ھ میں ہوا، تو ان تاریخی حقیقتوں کی

۱۔ اوریجنس آف محمڈن جورس پروڈنس ص ۲۳۰ ۲۔ امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ۱۴۳ھ تک امام ابو حنیفہ
اور دوسرے فقہاء کی فقہی تالیفات سامنے آگئی تھیں ۳۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک عمل بالحدیث اور دوسری رایوں
اور مسئلوں پر اس کی ترجیح کے لیے دیکھیے، انتقاء ابن عبد البر ص ۱۴۳-۱۲۲، موطا شیبانی اور آثار شیبانی کا تو
ہر صفحہ اس کا شاہد ہے، ان کے علاوہ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۶۸، سیرۃ النعمان، علامہ شبلی نعمانی ص ۱۲۴، اور ابو حنیفہ
مرتبہ ابو زہرہ ص ۱۱۰ - ۲۷۵ دیکھیے۔

روشنی میں جب ہم شاخت کے مذکورہ دعووں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ مندرجہ ذیل واقعات صرف تیس سال کے عرصہ میں ظہور میں آئے۔

۱۔ قدیم فقہی مکاتب فکر کا ظہور ہوا، اور

۲۔ ان تمام طبقات میں فکری طور سے ترقی اور تبدیلی آئی اور اجماع کے خیال کا نشو ونما ہوا

۳۔ ہر طبقہ فکر نے اپنی رایوں اور اقوال کو ماضی کی بڑی شخصیتوں سے منسوب کرنا شروع کیا، جیسا کہ اہل عراق نے ابراہیم نخعی سے اپنی رایوں کو نسبت دی۔

۴۔ اس سے بھی بڑھ کر، اپنی ذاتی رایوں کو اور زیادہ قدیم لوگوں سے منسوب کیا گیا جیسے کہ امام مسروق کی جانب اقوال کی نسبت کی گئی۔

۵۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ان کا انتساب شروع ہوا۔

۶۔ اور آخری اور انتہائی کوشش اس پر ختم ہوئی کہ اپنے ذاتی اقوال کو رسول اللہ کے اقوال سے تعبیر کیا گیا۔

۷۔ ان کوششوں کے ردعمل میں محدثین کا ظہور ہوا۔

۸۔ ان محدثین نے فقہاء کی ضد میں رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ کی سیرت اور اقوال وافعال سے متعلق احادیث وضع کیں۔

۹۔ اس ردعمل کے نتیجہ میں دونوں طبقات یعنی طبقۂ فقہاء اور طبقۂ محدثین میں آویزش اور رنجش قائم ہوگئی۔

۱۰۔ بالآخر فقہاء نے شکست کھائی اور محدثین کا اقتدار قائم ہوا۔

گویا تیس سال کے مختصر عرصہ میں ان سارے عوامل کا ظہور ہوا، اور وہ پایۂ تکمیل کو بھی پہنچ گئے!
کیا کوئی بھی عقل یہ باور کرسکتی ہے، کہ اس قدر وسیع علمی و نظری انقلاب کے لیے محض تیس سال کا

عرصہ کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعویٰ قطعی خلاف عقل ہے، شاخت کا یہ نتیجۂ مطالعہ، ایک خیال خام سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا، تحریک اور مخالف تحریک کا یہ افسانہ دراصل مغربی ذہن اور ماحول کی اپج ہے، اور تاریخی حقیقتوں کو مسخ کرنے کے علاوہ یہ اسلامی معاشرہ کی روح کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

محدثین اور فقہاء کے درمیان آویزش

محدثین اور احادیث نبویؐ کے خلاف فقہاء کے مختلف طبقات کی جانب سے حملہ اور مقابلہ کی داستان میں پروفیسر شاخت نے مدینہ، عراق اور شام کے فقہاء کی چند مثالوں کو پیش کیا ہے، جو بقول خود ان کے دعویٰ کو مدلل اور مضبوط کرتی ہیں، یہاں ایک ذاتی رائے کو پہلے اجمالاً بیان کرنے کے بعد ان کی بعض مثالوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

یہ بات ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ شاخت کی بحثوں میں جو بات سب سے نمایاں ہے، وہ ان کا متناقض الرائے ہونا ہے، ان کی تحریر پر نظر رکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ پہلے سے اپنی طے شدہ منزل تک پہونچنے کے لیے ایک نظریہ قائم کرتے ہیں، اس صورت میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ان کا یہ نظریہ گہری تحقیق اور سنجیدہ بحث کے نتیجہ میں قائم ہوا ہو، اسی لیے بحث کے دوران وہ متناقض باتیں پیش کرتے جاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ باہم متناقض اور متضاد دلیلوں میں وہ ربط اور توافق کیسے پیدا کریں گے، مثلاً ان کی تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کلام کے ساتھ ساتھ فقہاء کے تمام طبقات نے حدیث کی سختی سے مخالفت کی اور اسکا مقصد یہ تھا کہ حدیث ان کی فقہ میں زیادہ موثر اور دخیل عنصر نہ بن سکے،[1] اس کے بعد وہ ایک دوسری جگہ جب فقہی احادیث کے وضع ہونے پر گفتگو کرتے ہیں، تو یہ کہتے ہیں کہ کسی زمانہ میں وضع حدیث کو ثابت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس زمانہ میں فقہاء نے اس حدیث کا اپنی

---

[1] اوریجنس ص ۵۱۔

بحث میں ذکر کیا ہے یا نہیں، اگر فقہا کی بحثوں میں اس حدیث کا ذکر نہیں ہے، تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس حدیث کو بعد کو زمانہ میں وضع کیا گیا۔[۱]

سر دست ہم اس بحث میں نہیں پڑتے ہیں کہ یہ یقینی طور پر کیسے کہا جاسکتا ہے، کہ فلاں حدیث سے فقہا، نے اپنی علمی بحثوں میں استفادہ نہیں کیا ہو؟ اور کیا یہ کسی بھی شخص کے لیے ضروری اور ممکن ہے کہ وہ اپنی بحث کے دوران سارے دلائل پیش کرے؟ البتہ یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ہم شاخت کی اس متناقض اور متضاد رائے کو کیونکر تسلیم کریں، جب شاخت کے دعوی کے مطابق فقہا شدت سے احادیث نبوی کے مخالف تھے، تو پھر ان سے یہ امید کیونکر کی جائے کہ وہ باوجود مخالفت کے احادیث کو اپنی بحث و گفتگو میں شامل کریں گے؟ اور اگر حدیثوں کا ذکر واقعی ان کی بحثوں میں ناگزیر تھا، تو پھر حدیث سے ان کی دشمنی کا دعوی کیا محض افسانہ ثابت نہیں ہوتا ہے؟ یہ شاخت کے مجموعہ اضداد ہونے کی ایک مثال ہے،

ایک اور مثال محدثین اور فقہا، کے درمیان آویزش کو ثابت کرنے کے لیے شاخت نے ایک اور مثال دی ہے، وہ کہتے ہیں کہ فقہا نے احادیث کے مقابلہ میں آثار پر زیادہ اعتماد کیا ہے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے درج ذیل اعداد پیش کیے ہیں[۲]

	موطا امام مالک	موطا امام محمد شیبانی	آثار ابی یوسف	آثار امام محمد شیبانی
احادیث نبویہ	۸۲۲	۴۲۹	۱۸۹	۱۳۱
احادیث موقوفہ	۶۱۳	۶۲۸	۳۷۲	۲۸۴
آثار تابعین	۲۸۵	۱۱۲	۵۴۹	۵۵۰
آثار متاخرین	—	۱۰	—	۶

[۱] اوریجنس ص ۱۴۰ [۲] ایضاً ۲۲۔

اس خاکہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ موطا امام مالک (۱۷۹ھ) میں احادیث نبوی کی تعداد، کمیت کے اعتبار سے آثار صحابہؓ و تابعینؒ کے برابر ہے،

موطا امام محمد شیبانی (۱۸۹ھ) میں کمیت کے لحاظ سے آثار صحابہؓ و تابعینؒ کے مقابلہ میں احادیث کی تعداد تقریباً نصف ہے۔

آثار شیبانی میں اس کمیت کی نسبت ۱ = ۵ کی ہے، اور آثار ابی یوسف میں یہ نسبت تقریباً ۱ = ۶ کی ہے۔ اب اگر صحابہؓ و تابعینؒ سے مروی آثار کی بڑی تعداد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ احادیث نبوی کی اہمیت کم ہو گئی تھی، تو کوئی بھی شخص یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ امام شیبانی کے زمانہ میں تو احادیث کی اہمیت بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی ہو گی، کیونکہ امام شیبانی نے امام مالک کے انتقال کے دس سال کے بعد وفات پائی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کی موطا میں احادیث و آثار تقریباً مساوی تعداد میں موجود ہیں، ہاں آثار شیبانی میں آثار کی نسبت احادیث سے چھ گنا زیادہ ہے، لیکن اس بات سے شاخت کے اس دعوی کا ابطال ہوتا ہے کہ محدثین کا دباؤ فقہا پر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ان فقہا نے محدثین کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، اس دعوی کی دلیل میں وہ لکھتے ہیں کہ

چونکہ امام ابو یوسف کا زمانہ امام ابو حنیفہ کے بعد کا ہے، اس لیے احادیث نبوی کو قبول کرنے میں وہ امام ابو حنیفہ سے زیادہ محتاط تھے، امام شیبانی کا معاملہ ابو یوسف سے اس لیے مختلف ہے کہ انھوں نے موطا کو نقل کیا، تاہم ہر حدیث کے بعد وہ اپنے قول کی بھی تکرار کرتے ہیں۔

اب شاخت کے اس دعوی کو اگر ہم تسلیم کریں، تو یہ گویا دو متضاد رایوں کو ایک ہی وقت میں تسلیم کرنے کے مترادف ہو گا، یعنی جب ان کتابوں میں آثار صحابہؓ و تابعینؒ کی موجودگی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احادیث نبوی سے اعتنا کم ہو گیا تھا، تو پھر امام شیبانی کے متعلق یہ کہنا ہو گا کہ

انھوں نے اپنے اسلاف یعنی امام مالک وابو یوسف کی بہ نسبت احادیث سے اور بھی کم اعتنا کیا اور ان کے دور تک حدیث کی اہمیت تقریباً ختم ہوگئی، تو اس صورت میں شاخت کا یہ دعویٰ مہمل ہوجاتا ہے کہ محدثین کا غلبہ فقہا پر بڑھتا گیا، اور بالآخر فقہا نے محدثین کے سامنے سپر ڈالدی ان دونوں متضاد دعوؤں میں باہم توافق کی کیا کوئی اور شکل بھی ہے۔؟

البتہ ہم شاخت کے مذکورہ دعوی کے بارہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے فقہاء کے اس اعتماد اور اقرار کو یکسر رد کردیا کہ تشریع کے میدان میں اولیت اور اہمیت احادیث نبوی کو ہی حاصل ہے، اسی طرح شاخت نے فقہاء کی کتابوں کی ان صدہا مثالوں سے صرف نظر کیا جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان فقہاء نے حدیث پر عمل کو ترجیح دی، اسی طرح انھوں نے امام شافعی کے اس قول کو بھی تسلیم نہیں کیا، جس میں امام صاحب نے اپنے مسلک کے مخالف فقہاء کے بارے میں یہ کہا کہ یہ لوگ حدیث نبوی پر تعامل اور اس سے استدلال کرنے میں بہرحال ان کے ہم مسلک ہیں، اور اس معاملہ پر وہ سب متفق ہیں، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شاخت، امام شافعی کا یہ قول بخوشی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے مسلک کے مخالف فقہاء نے چند حدیثوں پر عمل کو ترک کردیا ہے، حالانکہ ان فقہاء نے جن احادیث کو قبول کیا ہے، ان کے مقابلہ میں ایسی حدیثوں کی تعداد نہایت کم ہے، جن کو انھوں نے بعض اصولوں کے تحت ترک کیا ہے، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ شاخت امام شافعی پر علمی غیر امانت داری اور سوء فہم کا الزام عائد کرتے ہیں، مگر جب امام شافعی کے ایک قول سے ان کے نتیجہ فکر کا کوئی شگوفہ شاداب ہوتا نظر آتا ہے تو پھر وہ اسوقت اپنے لگائے ہوئے الزام سے اغماض برتنے میں ذرا تکلف نہیں کرتے ہیں، بایں ہمہ امام شافعی کے اعتراضات کو قبول کرنے میں اگر وہ کسی اصول پر کاربند ہوتے تو حیرت نہ ہوتی لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ شاخت نے جسارت کے ساتھ ایک فیصد کو سو فیصد بنا کر پیش کیا ہے، اس علمی تحقیق کو اگر کوئی صاحب نظر

محض شعبدہ بازی سے تعبیر کرے تو کیا یہ غلط بات ہوگی۔

شاخت کی تحقیق کی اصولی غلطیاں،

شاخت کی مذکورہ بالا تحقیق کے مطالعہ کے دوران بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ قدم قدم پر اصولی اور منہجی غلطیاں کرتے جاتے ہیں۔

یہ ایک عام اصول ہے کہ کسی قضیہ میں کسی شخص کی رائے معلوم کرنا ہو یا کسی سے اس کے عقیدہ اور مسلک کے بارے میں کچھ جاننا ہو تو صاحب معاملہ سے براہ راست معلومات حاصل کرنا ہی بہتر اور انصاف کی بات ہے، اس طرح اس شخص کا قول زیادہ صحیح اور مستند ہوگا، اور جب کسی کے قول کی صداقت اور صحت معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی تو اس کے قول کو اس کے فعل و عمل کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، لیکن شاخت کے کارخانہ تحقیق میں اس کسوٹی کا وجود نہیں ہے، وہ احادیث رسول اللہ ﷺ کے بارے میں خود فقہاء کے اس قول کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، کہ وہ یعنی فقہاء احادیث نبوی کے پابند ہیں، اور انہی پر ان کا عمل ہے، وہ مختلف مسلکوں کے نمائندہ فقہاء کی اس بات سے بھی متفق نہیں ہیں کہ احادیث نبوی کی عظمت و جلالت کے متعلق وہ سب ایک دوسرے سے اتفاق کرتے ہیں، شاخت ۹۹ فیصد ایسے قضایا و معاملات سے بھی صرف نظر کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فقہاء نے احادیث نبوی سے استدلال کیا، اس کے برعکس وہ کسی فریق مخالف کا یہ اعتراض فوراً تسلیم کرتے ہیں، کہ فلاں فقیہ نے کسی مسئلہ میں حدیث رسول کو قبول نہیں کیا، خواہ ایسے مسائل تعداد میں ایک ہی فیصد کیوں نہ ہوں۔

اسی طرح وہ امام مالک کی رایوں سے چند مثالیں منتخب کرتے ہیں، اور ان سے جو نتائج نکالتے ہیں اس کی ذمہ داری میں سارے مدینہ والوں کو شامل کرتے ہیں، گویا مدینہ میں امام مالک کے علاوہ دوسرے صاحب الرائے فقہاء کا نہ تو وجود تھا، اور نہ علمائے مدینہ میں کسی مسئلہ میں کوئی اختلاف رائے ہوا تھا،

عراق کے مکتب فکر کے سلسلہ میں ان کے نتائج اور زیادہ عجیب وغریب ہیں، احناف کے مکتب فکر سے وہ کوئی ایک مثال لیتے ہیں، پھر وہ اس کو نہ صرف کوفہ بلکہ پورے عراق والوں پر منطبق کر دیتے ہیں، ان کا یہی معاملہ امام اوزاعی کے ساتھ بھی ہے، اس اجمال کی تفصیل میں ہم بعض اور مثالیں پیش کرتے ہیں،

معتزلہ اور حدیث ایک جگہ شاخت نے حدیث کے مخالف فقہاء کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک طبقہ کو وہ سخت اور متشدد قرار دیتے ہیں، اور دوسرے کو نسبتاً نرم اور معتدل سمجھتے ہیں، ان کے خیال میں معتزلہ کا شمار متشدد طبقہ میں ہے، مگر خود معتزلہ کی رایوں کا جائزہ لیا جائے، تو شاخت کی یہ تقسیم یک طرفہ اور حقیقت کے خلاف ثابت ہوتی ہے، مثلاً مشہور معتزلی، خیاط جنھوں نے اپنی کتاب الانتصار کو ۳۰۰ھ سے پہلے مدون کیا تھا، اس میں انھوں نے دوسری اور تیسری صدی ہجری کے بعض کبار معتزلہ کے اقوال نقل کئے ہیں، (دیکھئے مذکورہ کتاب ص ۶۸، ۵۷، ۱۱۸) اور ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ وہ سنت اور حدیث نبویؐ پر کاربند اور اس کے پابند ہیں، اسی طرح ابن المرتضیٰ نے اپنی کتاب طبقات معتزلہ کی ایک طویل فہرست میں نامور معتزلی محدثین کے ناموں کا ذکر کیا ہے، (دیکھئے ص ۱۳۳-۱۴۰) اس فہرست میں بعض ناموں کی شمولیت کو محل نظر ہے۔ تاہم محدثین کی ایک خاصی بڑی تعداد سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن شاخت ان ساری سچائیوں پر یہ کہہ کر پردہ ڈالتے ہیں کہ یہ لوگ قدیم معتزلہ کے نمائندہ نہیں ہیں[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ شاخت نے خود قدیم معتزلہ کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے اس موقف کی بنیاد ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ کی چند باتوں پر ہے، ابن قتیبہ کی معتزلہ دشمنی معروف ہے، ان کی بعض باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ اہل کلام معتزلہ ایسے تھے، جو حدیث کی اہمیت کے چنداں قائل نہیں تھے، ابن قتیبہ کی یہ رائے

[1] اوریجنس۔ ص ۲۵۵۔

اگر درست تسلیم کرلی جائے، تو بھی شاخت کے رویہ کے بارہ میں یہ سوال اٹھتا ہے، کہ یہ کون سی منطق ہے، اور یہ کیسا طریقۂ استدلال ہے؟ لیکن مستشرقین کی نفسیات سے واقف لوگوں کیلئے یہ بہرحال حیرت کی بات نہیں ہے، کیونکہ ایک مستشرق نے صریحاً اس حقیقت سے انکار کیا کہ قرآن مجید، قرن اول میں تحریری شکل میں موجود تھا، اور اس کے لیے انھوں نے یہ دلیل کافی سمجھی کہ یوحنا دمشقی مسیحی نے کہیں یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں میں کوئی کاتب بھی تھا، (یہ یوحنا دمشقی مسیحی، پہلی صدی ہجری کے اواخر میں شام میں تھا، اور اسلام سے دشمنی اور نفرت کے لیے مشہور تھا)، شاخت نے حدیث کے مخالفین کے دوسرے معتدل طبقہ میں تقریباً تمام فقہاء کو شامل کیا ہے، خصوصاً مدینہ، شام اور عراق کے مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کو انھوں نے اسی طبقہ میں جگہ دی ہے، اس تقسیم کے لیے وہ امام شافعی کی بعض تحریروں سے سند حاصل کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان تحریروں سے حدیث کے مخالف فقہاء کا تعین ہوتا ہے، یہاں شاخت کے اصول و دلائل پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاخت کی نظر میں امام شافعی کا کیا مرتبہ و مقام ہے، وہ امام شافعی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"امام شافعی نے عراقیوں (حنفیوں) کے اصول و مبادی میں کثرت سے تحریف کی ہے"[1] دوسری جگہ وہ بجائے عراقیوں کے شامی مکتب فقہ کے متعلق امام شافعی کی اسی بات کو دہراتے ہیں، اور تائید میں تیس چالیس مثالیں پیش کرتے ہیں[2]، امام شافعی کے متعلق ان کی یہ رائے بھی ہے کہ وہ فریق مخالف کی باتوں میں اپنی جانب سے بھی اضافہ کر دیا کرتے تھے[3]۔ انھوں نے چند ایسی مثالیں پیش کی ہیں، جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے، کہ علمی مسائل میں امام شافعی موضوع کے پابند نہیں رہتے تھے، اس کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر شاخت کی نظروں میں امام شافعی کا

[1] اوریجنس۔ ص ۳۲۱ [2] ایضاً۔ ص ۲۲ - ۳۲۱

یہی مرتبہ و مقام ہے، تو پھر مخالفین پر امام شافعی کے اعتراضات کو قطعی طور پر دلیل بنا لینا کیسے جائز ہے، لیکن شاخت کو اس سے بحث نہیں، وہ صرف اپنی مرضی کے مطابق، بغیر کسی منطقی جواز کے، امام شافعی کے ایک قول کو کبھی نظر استحسان سے دیکھتے ہیں اور کبھی دوسرے قول سے صرف نظر کرتے ہیں،

فقہاء حنفیہ اور حدیث اوپر کی سطروں میں ہم شاخت کی اس رائے کو نقل کر چکے ہیں کہ آثار صحابہ کو حدیث پر ترجیح دی گئی، جس سے حدیث کی مخالفت اور عداوت کا اظہار ہوتا ہے۔

چنانچہ جب انھوں نے حدیث کے متعلق فقہاء حنفیہ کا ذکر کیا تو لکھا کہ عراقیوں (حنفیوں) کا مسلک یہ ہے کہ حدیث کو اس کے مقام سے گرا کر دوسرے درجہ پر رکھا جائے، اور اس کے مقابلہ میں صحابہ کے آثار و اقوال کو ترجیح اور فضیلت دی جائے، اپنی اس رائے کی تائید میں انھوں نے امام شافعی کا یہ قول نقل کیا کہ "وہ (احناف) یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی صحابی کی مخالفت نہیں کرتے حالانکہ انھوں نے حضرت عمرؓ کے حکم کی مخالفت کی، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کسی ایسے شخص کی رائے کو قبول نہیں کرتے جو قیاس کو ترک کرتا ہو، حالانکہ وہ خود قیاس کو ترک کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں متناقض باتیں پیش کرتے ہیں"۔[1]

شاخت کے اس اعتراض و دلیل کے متعلق سب سے پہلے تو ہم یہی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کے رد میں امام شافعی کے قول پر وہ کیسے اعتماد کرتے ہیں، جب کہ وہ امام شافعی پر علمی عدم امانت کا الزام بھی عائد کرتے ہیں، آخر یہ کونسا اصول ہے؟ وہ احناف کی اس بات پر اعتماد کیوں نہیں کرتے کہ

لاحجۃ فی احد مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم — نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کوئی قابل حجت نہیں ہے،[2]

---

[1] اوریجنس، ص ۲۹ [2] دیکھیے الحجۃ علی اہل المدینۃ، امام شیبانی ج ۱ ص ۴۵-۴۰۲، کتاب الام امام شافعی ج ۷، ص ۲۹۲، کتاب الخراج، امام ابو یوسف ۵۸، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۸۹۔

پھر امام شافعی کے مذکورۂ بالا قول سے یہ کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ احناف، حدیث کے مقابلہ میں آثار صحابہؓ کو ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں، کیونکہ امام شافعی تو احناف کے اس قول پر اظہار رائے کرتے ہیں، کہ وہ اصحاب نبیؐ میں کسی کی مخالفت نہیں کرتے ہیں، حدیث و سنت رسولؐ سے اس قول کا تعلق ہی نہیں ہے، اپنے قول کی تائید میں شاخت کے لیے بہتر یہ ہوتا کہ وہ صراحت اور شمار کے ساتھ ثابت کرتے کہ اکثر و بیشتر فقہی معاملات میں ایک حدیث کے پائے جانے کے باوجود، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے سنت و حدیث کی مخالفت کی اور اس کے مقابلہ میں آثار صحابہ کو ترجیح دی۔

فقہائے مدینہ اور حدیث فقہاء مدینہ کے بارے میں شاخت کی تحقیق یہ ہے کہ متعدد قضایا و معاملات میں انھوں نے حدیث سے استفادہ کیا ہے، لیکن بہت سے مقامات پر حدیث سے صرف نظر بھی کیا ہے، لیکن جب ہم موطا امام مالک پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تو یہ دیکھتے ہیں، کہ وہ ۸۲۲ حدیثوں پر مشتمل ہے، احادیث کی اتنی بڑی تعداد میں صرف تین حدیثیں ایسی ملتی ہیں، جن سے امام مالک نے استدلال نہیں کیا ہے،[3] اسی طرح امام مالک نے ۶۱۳ آثار صحابہ کی روایت کی ہے اور ان میں سے صرف دس روایتیں ایسی ہیں جن پر ان کا عمل نہیں ہے،[4] اس حقیقت حال سے باخبر ہونے کے بعد شاخت یا کسی بھی شخص کے لیے یہ کہنا کیسے زیب دیتا ہے کہ فقہائے مدینہ، اکثر صورتوں میں احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تغافل اور تجاہل کا معاملہ کرتے ہیں،

امام مالک نے موطا میں یہ مشہور حدیث بھی روایت کی ہے کہ

ترکت فیکم امرین لن تضلوا	میں تمھارے لیے دو باتیں چھوڑے جاتا ہوں
ما تمسکتم بھما کتاب اللہ	جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے

---

[3] دیکھیے موطا امام مالک۔ ص ۳۸۷ – ۴۸۶ – ۶۱۷ – [4] ایضاً ص ۸۹، ۱۲۵، ۲۰۶، ۳۹۶، ۴۴۹، ۴۶۲، ۶۰۸، ۸۴۸، ۸۲۶، ۸۵۱۔

سنۃ رسولہ[1] قطعی گمراہ نہ ہوگے ایک کتاب اللہ اور دوسرے
اس کے رسول کا اسوہ۔

لیکن شاخت موطا میں اس بنیادی حدیث کی موجودگی سے متاثر نہیں ہوتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ بہرحال، فقہی مباحث میں فقہائے مدینہ حدیث پر اعتماد نہیں کرتے ہیں، اور جن فقہائے مدینہ کا حدیث پر عمل ثابت ہے وہ امام شافعی سے ایک پشت پہلے کے لوگ تھے[2]، اب شاخت کی ان تحقیقات بلکہ خیالات کا جو علمی پایہ متعین ہوتا ہے، وہ کس صاحب نظر سے پوشیدہ ہے؟

شاخت کی ایک اور خصوصیت ہم اوپر یہ بتا چکے ہیں کہ شاخت نے فقہاء کو متشدد اور معتدل دو حصوں میں تقسیم کیا ہے[3]، معتدل فقہاء میں انھوں نے مدینہ، کوفہ یا عراق والوں اور امام اوزاعی کے مکتب فکر کو شامل کیا ہے[4]، حدیث کی مخالفت میں ان کا خیال یہ ہے کہ یہ تمام فقہاء آثار صحابہ کو زیادہ ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں، شاخت اپنے اس نظریہ کی تائید میں صالح بن کیسان کا یہ قول نقل کرتے ہیں[5]: میں اور زہری ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے، ہم نے کہا کہ ہم حدیثوں کو لکھیں گے، اس پر زہری نے کہا کہ ہم رسول اللہؐ سے مروی حدیثوں کو لکھیں گے اور صحابہؓ سے منقول روایتوں کو بھی ضبط تحریر میں لائیں گے اس لیے کہ وہ بھی سنت (حدیث) کے درجہ میں ہیں، تو میں نے کہا کہ نہیں آثار صحابہ کو میں حدیث نہیں مانتا، اس لیے ان کو نہیں لکھوں گا، صالح بن کیسان اس کے بعد کہتے ہیں کہ زہری نے آثار صحابہ کو لکھا اور میں نے نہیں لکھا تو وہ کامیاب ہوگئے، اور میں ضایع ہوگیا"[6]

اس روایت سے کہیں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ فقہائے مدینہ احادیث پر آثار کو ترجیح دیتے تھے، ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ صالح اور زہری دونوں احادیث کے لکھنے پر متفق تھے، البتہ آثار صحابہ کو اہمیت دینے میں صالح زہری کی رائے سے متفق نہیں ہے، دوسرے یہ کہ علم میں زہری، صالح سے زیادہ کامیاب تھے، مذکورہ روایت کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ واقعہ پہلی صدی کے نصف حصہ کے بعد کا ہے، تو اگر اس دور میں صالح اور زہری دونوں نے حدیثوں کو مرتب کیا تھا تو پھر شاخت کے اس قول میں کتنی صداقت رہجاتی ہے کہ ساری حدیثیں دوسری اور تیسری صدی میں وضع کی گئیں۔ (باقی)

[1] موطا ص ۱۵۱
[2] ادب المجلس ص ۱۲
[3] ایضاً ص ۱۴۴-۵۲
[4] ایضاً ص ۲۴۸-۲۹
[5] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۳۵

یاد رفتگاں

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا معین الدین اجمیری کو مزید خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

فرائض کے ساتھ نوافل اور مستحبات کے بھی آخر وقت تک پابند رہے، علمی مشاغل بھی جاری رکھے، ترمذی شریف کا ایک ناتمام حاشیہ لکھا، وجود علم و معلوم کلی طبیعی اور مسئلہ دہر پر ان کی تقریروں کا ایک مجموعہ ہے، حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی ایک محققانہ سوانح عمری بھی لکھی تھی، جو شاید چھپ نہ سکی، مگر سید صاحب ان کے ان اوصاف کے ساتھ ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو جو عشق رہا اس سے زیادہ متاثر رہے۔ لکھتے ہیں:۔

ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ حضورؐ کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار پکار اٹھیں یا ابتاہ (اے میرے باپ) سرکار دو عالمؐ نے فرمایا۔ لا کرب علی ابیک بعد الیوم (آج کے دن کے بعد تمھارے باپ پر مصیبت نہیں ہے) اس جملہ پر مولانا بے تاب ہوجاتے، آنسو نکل آتے، چیخ نکل پڑتی، بسا اوقات غشی طاری ہوجاتی، مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آتا۔ (یاد رفتگاں صفحہ ۲۰۱)

آخر میں سید صاحبؒ لکھتے ہیں، کہ زندگی میں گورغریباں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا، وہاں کے

ایک چھوٹے مکان میں وفات پائی، ان کا جنازہ اٹھا تو چارپائی میں لمبی لمبی بلیاں باندھ دی گئی تھیں کہ بیک وقت پچاسوں مسلمان کندھا دیتے تھے، پھر بھی ہجوم اور لوگوں کے اشتیاق کی کوئی حد نہ تھی، خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیر سایہ تدفین ہوئی، قبر میں اتارتے وقت دیواروں اور درختوں پر انسانوں کا ہجوم تھا" (یادِ رفتگاں، صفحہ ۲۰۲)

مدراس کے علماء سید صاحب کی نظر جنوبی ہند کے علماء کی طرف بھی برابر اٹھتی رہی، نجی صحبت میں وہ فرمایا کرتے کہ مدراس سے ان کو عشق ہے، اس لیے کہ اسی طرف سے ہندوستان میں اسلام کا پہلا قافلہ داخل ہوا، اسی عشق میں مدراس میں سیرۃ النبیؐ پر جو خطبات دیے، ان کا نام بھی خطبات مدراس رکھا، پھر ان کو مدراسی علماء سے کیوں نہ دلچسپی ہوتی

مدراس میں روشن کمپنی کے حاجی عمر ایک کامیاب تاجر تھے، ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:- کہ وہ توحید و سنت کے بڑے متبع تھے، انھوں نے شمالی ارکاٹ میں عمرآباد ایک آبادی قائم کی، اور وہاں ایک بڑے مدرسہ دارالسلام کی بنیاد رکھی، ان کی وفات کے بعد ان کے منجھلے بیٹے سیٹھ ابراہیم نے اس کی دیکھ بھال اور اس کے قیام و ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا، مدرسہ کے کتب خانہ کی ایک عمارت بنوائی، اس کے لیے کتابیں خریدوائیں، طنطاوی کی تفسیر کا اردو ترجمہ مطبع معارف میں چھپوایا، ان کی جوان مرگی پر سید صاحب نے لکھا کہ افسوس کہ یہ پھول کھلنے سے پہلے مرجھا گیا، ۲۰ رجب ۱۲۵۷ھ کو اس دنیائے ناپائدار کو الوداع کہا، رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۷)

مدراس کے علاقے میں جب کرنول میں مسلمانوں کی حکومت تھی، تو اسی کے ایک خاندان سے مولانا حاجی محمد عمر المتوفی ۱۹۴۶ء تعلیم پاکر ایک معمولی مدرسہ کی خدمت میں لگ گئے، تو اس کو بڑی ترقی دی، اور وہاں کے سند یافتہ اچھے اچھے عہدوں پر

مامور ہوئے، ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر عبدالحق بھی تھے، جو مدراس کے مشہور ماہر تعلیم گذرے ہیں، وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت بھی تھے، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے بھی فیض حاصل کیا، حکومت سے شمس العلماء کا خطاب بھی ملا، ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے بہت دلگیر ہو کر لکھا کہ ان کے علم و فضل، نیکی و تقویٰ کے سبب سے حاکم و محکوم دونوں طبقوں میں انکی ہر دلعزیزی تھی، ان کی وفات سے علوم قدیمہ کا خاتمہ ہوگیا، وہ اسلاف کی زندگی کا نمونہ تھی، ہر طرح کے آرام کے باوجود ہمیشہ خود اختیارانہ فقر کی زندگی پسند کی، اور دنیاوی املاک میں سے نہ زمین چھوڑی، نہ مکان، اور نہ نقد، ہمیشہ یہی آرزو رہی، کہ دنیا سے ایسے روانہ ہوں کہ ترکہ کا حساب نہ دینا پڑے، وہی بعینہ پیش آیا، رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ (یادِ رفتگاں صفحہ ۳۳۹)

یہ لکھتے وقت سید صاحب کو خوشی ہو رہی ہوگی، کہ ان کے طبقہ کے لوگ اپنے کردار اور سیرت کی کیسی کیسی اعلیٰ مثالیں چھوڑ گئے ہیں۔

سندھ کے عالم سید صاحب کی نظر سندھ کے دور دراز علاقہ کے علماء پر بھی رہی جھنڈا گوٹھ ضلع حیدرآباد سندھ کے مشہور عالم پیر احسان اللہ شاہ صاحب (متوفی ۱۹۳۰ء) کی وفات ہوئی تو ان پر یہ ماتمی تحریر لکھی:-

مرحوم حدیث و رجال کے بڑے عالم تھے، ان کے کتب خانہ میں حدیث و تفسیر و رجال کی نایاب قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ مشرق و مغرب، مصر و شام، عرب و قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں ان کے کاتب و ناسخ قلمی کتابوں کی نقل پر مامور رہتے تھے، مرحوم ایک خانقاہ کے سجادہ نشین اور طریق سلف کے متبع، اور علم و عمل دونوں میں ممتاز تھے۔ (ایضاً ص ۱۸۶)

اس تحریر کو پڑھتے وقت ناظرین کو خیال ہوگا کہ سید صاحبؒ اپنے علماء کے طبقہ میں سے

ہر ممتاز فرد کی خوبیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے اور ان کو پیش کرنے میں خود خوشی محسوس کرتے۔

سید صاحب نے اپنے دور کے علماء کی وفات پر جو کچھ لکھا ہے، اس کو ایک علحدہ کتاب میں شائع کر دیا جائے، تو یہ تذکرہ علمائے ہند کی ایک مستقل جلد ہو جائے، ان کے اوصاف بیان کرنے میں اس کی تفریق نہ کرتے کہ وہ کس مسلک، کس عقیدہ اور کس مکتب فکر اور کس مدرسہ کے سند یافتہ ہیں، اس سے بے نیاز ہو کر ان کے محاسن، مناقب اور اوصاف پر ان کی نظر ہوتی،

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوگا کہ ان کے تعلقات اہل حدیث علماء سے ویسے ہی رہے جیسے حنفی علماء سے تھے، اور اہل حدیث علماء کی تعریف و تحسین میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی بلکہ ان میں جو اوصاف تھے، ان کو دل کھول بیان کیا ہے، ان کی اس فراخ دلی اور رواداری کی وجہ سے بعض حلقہ میں ان کو اہل حدیث اور سلفی سمجھا گیا، حالانکہ جو لوگ ان کی خانگی اور خاندانی زندگی میں ان سے قریب تر رہے ہیں، وہ پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، کہ وہ ہر لمحہ اور ہر ساعت میں اپنی زندگی میں حنفی عقائد اور مسلک کے پابند رہے، یہ اور بات ہے کہ ان میں اعتدال پسندی تھی، جیسا کہ خود انھوں نے مولانا ابوبکر شیث کے ذکر میں لکھا ہے، کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا اور انھوں نے مانا بھی کہ ایک مذہب ہے جس کے دو ہی پیرو ہیں، ایک وہ اور ایک میں، مقصود تقلید و عدم تقلید کے مسائل میں اعتدال سے تھا، سید صاحبؒ کی یہی اعتدال پسندی ان کی سیرت اور ان کے مذہبی مسلک کی نمایاں خوبی تھی۔

ارباب علم و دانش پر ماتم

ان کے زمانہ میں جن ارباب علم و دانش نے وفات پائی ان کے مختصر حالات لکھ کر ان پر بھی ماتم کیا، اور ان کی خوبیوں کی طرف خاص توجہ دلائی، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی (المتوفی ۱۹۱۷ء) سے ان کے ذاتی تعلقات تھے، ان کے علمی کارناموں میں قران

اسعد بن کی تقریظ و تحشیہ اور قواعد اردو اور اردو لغات کی تکمیل کی کوشش کو سراہنے کے بعد ان کے مدرسہ نبات المسلمین کی تاسیس کا بھی ذکر کرتے ہیں، ان کی جس چیز سے خاص طور پر وہ متاثر ہوئے، اس کی طرف یہ لکھ کر توجہ دلائی ہے کہ

> بقول علامہ شبلیؒ مرحوم مولانا حالی کے بعد کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے، تو وہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ہیں، افسوس کہ دوسرا حالی بھی ہماری دنیا سے رخصت ہوگیا، مرحوم کا سہل اور رواں کلام ہمارے بچوں کا ابتدائی سبق تھا، وہ اپنی پیرانہ سالی کی مرتعش زبان سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس پیار سے سمجھاتے تھے، کہ وہ نصیحت کی گراں باری کو کھلونے سمجھ کر اٹھا لیتے تھے، افسوس کہ یہ کھلونا بنانے والا بھی اب نہ رہا۔" (یادرفتگاں۔ صفحہ ۳۰)

ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی (المتوفی ۱۹۲۱ء) سے ان کے بڑے قلبی تعلقات رہے۔ جیسا کہ مکتوبات مہدی کے دیباچہ کی ان کی تحریر سے معلوم ہوگا، ان کی وفات پر معارف میں بہت پھیلا کر توجہ تو نہ لکھ سکے، لیکن اس کے دو تین جملے کسی کے پورے مضمون پر بھاری ہیں، وہ لکھتے ہیں، کہ وہ ایک سحر نگار ادیب اور ایک خاص طرز کے موجد تھے، ادب و انشا کا ایسا ذوق سلیم رکھنے والے افراد مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، افسوس ہے کہ یہ ماہتاب کمال پیوند خاک ہوگیا۔ (ایضاً۔ ص ۴۴)

وہ مولانا عبدالحلیم شرر (المتوفی ۱۹۲۶ء) سے اپنے بچپن کے زمانہ سے متاثر تھے، جب ان کا ناول منصور موہنا پڑھا تھا، تو پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے، وہ ندوہ تعلیم کے لیے آئے، تو اس زمانہ میں بھی ان سے ملتے جلتے رہے، ان کے رسالہ دلگداز، پردۂ عصمت اور اتحاد پھر ان کے ناولوں میں منصور موہنا، درگیش نندنی، فتح اسپین، مقدس نازنین، ملک العزیز ورجنا، فردوس بریں

اور فلورا فلورنڈا کے علاوہ ان کی تصانیف میں تاریخ سندھ، تاریخ رسلی، خاتم المرسلینؐ، ابو بکر شبلی، اور جنید بغدادی کے قدر داں رہے، پھر ان کی عربی دانی کے بھی معترف تھے، ان کی وفات پر ان کے کچھ حالات لکھ کر ان کا ماتم اس طرح کیا کہ

"چھیالیس برس کا عہد خدمت ان کے کسی معاصر کو میسر نہیں آیا، ان کی ادبی اور علمی خدمات کی گوناگونی اور کثرت بھی ان کا خاص امتیاز ہے، ان کی تصنیفات نے اردو میں سیکڑوں انشا پرداز پیدا کئے، اور ملک میں تاریخ کا مذاق پیدا ہوا، اور سنجیدہ تصانیف کے لیے حسن قبول کا راستہ صاف کیا، وہ ہماری زبان کے نامور مصنف، ہندوستان کا فخر اور لکھنؤ کی آبرو تھے، ان کے فانی جسم نے مفارقت کی، مگر انکی ابدی زندگی ہمیشہ قائم اور باقی رہے گی۔"

(یادِ رفتگاں۔ صفحہ ۷۴، ۷۶)

سید صاحبؒ ایک عالم تھے، مولانا شرر کی شہرت زیادہ تر ایک فاضل ناول نگار کی حیثیت سے رہی، ایک عالم کی ایک ناول نگار کی شان میں یہ مدح سرائی عالمانہ فراخ دلی مزید ثبوت ہے۔

سرسید کے معاصر اٹاوہ کے مولانا بشیر احمد المتوفی ۱۹۲۷ء کو بسا غنیمت اس لئے سمجھتے تھے، کہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ تاریخ بیجاپور، فرامین شاہی، اور عصاے پیری جیسی کتابیں مرتب کیں۔ (ایضاً۔ ص ۸۰)

سید جالب دہلوی (المتوفی سنہ ۱۹۳۰ء) سے بھی ان کے مراسم رہے، اور وہ ان کی اخبار نویسی کے فن کی مہارت، اور انکی گوناگوں قلمی خوبیوں کے بیحد قائل تھے، اس لیے ان کی وفات پر بہت ہی افسردگی اور رنج کے ساتھ لکھا، کہ وہ علم کے ایک سچے طالب اور عاشق تھے، ان کی کہنہ مشقی، اور اخباری وسعت اطلاع، عام معلومات کی آگاہی، تاریخی ذوق

کتب نادرہ سے سچا عشق، ان کی زندگی کی خصوصیات تھیں، کہنہ مشق اخبار نویس اور اخبار نویسی کے ایک ایک فن کا واقف کار شاید ہی مسلمانوں میں کوئی دوسرا ہوا ہو، بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے، کہ اگر سید جالب کا وجود نہ ہوتا، تو اخباری حیثیت سے لکھنؤ کا کوئی وزن اور وقار نہ ہوتا۔

(یادِ رفتگاں۔ صفحہ ۱۰۸ و ۱۰۹)

مولانا حیدر یار جنگ حیدر علی نظم طباطبائی لکھنوی (المتوفی ۱۹۳۳ء) سے سید صاحب کی ملاقات تو نہیں ہوئی، مگر وہ ان کے ذوق شعری کے معترف تھے، وہ حیدر آباد میں ملازم تھے، ان کی وفات پر لکھا، کہ وہ چمنستان روزگار کی باسی بہار اب دیکھ کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے، آخر شاہ اودھ کے دربار کی خزاں دیکھی تھی، مٹیا برج کلکتہ کی شاعرانہ مجلسوں کی یادگار تھے، علوم عربیہ کے علاوہ شعر و سخن کے فنون پر کامل عبور رکھتے تھے، اس عمر کے باوجود آخر تک علمی کاموں میں مصروف و منہمک رہے، شرح غالب اور بعض رسائل و مقالات یادگار ہیں، اللہ تعالے کرم فرمائے۔ (ایضاً۔ ص ۱۴۴)

مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار (المتوفی ۱۹۳۳ء) سے براہ راست ملاقات نہیں ہوئی، مگر ان کی قدر اس لیے کی، کہ وہ اردو کے سب سے پہلے روزانہ اخبار کے اڈیٹر تھے، اور ان کی وجہ سے ملک میں تاریخ اور سیاحت ناموں کے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا، انھوں نے یورپ اور اسلامی ممالک کے دو سفر بھی کئے، اور ان کے سیاحت نامے بھی لکھے، ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے لکھا کہ اب ان کا وہ سفر پیش آیا، جس کا سفرنامہ انسانوں کے ہاتھ نہیں فرشتوں ہاتھ لکھتے ہیں، اس اندھیری منزل کے بوڑھے مسافر پر اللہ تعالے کی رحمت ہو۔ (ایضاً۔ ص ۱۴۵)

میر ناصر علی مدیر صلاے عام دہلی نے عمر کی ۸۶ بہاریں دیکھ کر ۱۲ جون ۱۹۳۳ء کو وفات پائی، تو سید صاحب نے لکھا، کہ ان کے علم میں جو نزاکت اور ان کی انشا میں جو لطافت تھی وہ

اب بھی ہماری زبان کا سرمایہ ہے۔ (یادِ رفتگاں۔ صفحہ ۱۴۸)

مارماڈیوک پکتھال (المتوفی ۱۹۳۶ء) انگریز تھے، مگر اسلام قبول کر لیا تھا، سید صاحب ان سے لندن اور حیدر آباد میں برابر ملتے رہے، آخر میں وہ حیدر آباد کی سول سروس کے اتالیق اور رسالہ اسلامک کلچر کے اڈیٹر بھی ہوگئے تھے، اس زمانہ میں ان کی خواہش ہوئی کہ وہ قرآن مجید کا ایک ایسا انگریزی ترجمہ کریں جو دلوں کو گرمائے، اس ترجمہ کے ابتدائی مراحل میں سید صاحبؒ سے بھی کچھ مشورے لیے ان کی وفات پر انھوں نے لکھا کہ وہ نو مسلم انگریز تھے، مگر ایمان کے ساتھ نماز اور روزہ کے پابند تھے۔ (ایضاً۔ ص ۱۶۲)

مولوی نور الحسن نیر خلف حضرت محسن کاکوروی (المتوفی ۱۹۳۶ء) سے سید صاحب کو اس لیے لگاؤ تھا، کہ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد بھی رہے، اس کے علاوہ ان کی عزت ان کی نظر میں اس لیے بھی تھی، کہ وہ سخن ور، سخن سنج، سخن شناس اور سخن داں سب کچھ تھے، سید صاحب کے خیال میں ان کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ نور اللغات کی تالیف ہے۔

(ایضاً۔ صفحہ ۱۶۳)

خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی (المتوفی ۱۹۴۰ء) لکھنو میں دروازہ حیدر بخش کی مسجد کے نیچے کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان کے مالک تھے، مگر یہی دوکان بقول سید صاحبؒ نصف صدی تک لکھنو کے اہل علم و ادب کا مرکز بنی رہی، سید صاحبؒ کی نظر میں ان کی قدر اس لیے تھی کہ لکھنو کی راجدھانی اور لکھنو کے جان عالم کی کہانی ان کا خاص موضوع تھا، لکھنو کی بول چال، محاوروں اور روزمروں کو بخوبی برتتے تھے۔ (ایضاً۔ ص ۲۰۵)

پٹنہ کے مسٹر نصیر بیرسٹر (المتوفی ۱۹۴۲ء) سے سید صاحب کے کافی مراسم اپنے چچا کی وجہ سے رہے، اس کے علاوہ وہ ندوہ کے دلدادہ تھے، سید صاحب کو ان سے دلچسپی

اس لئے بھی پیدا ہوئی، کہ وہ کوٹ پتلون پہننے والے صاحب بہادر کے رہنے کے بعد ریش سپید کے ساتھ اچکن اور کرتہ میں تسبیح وسجادہ کی طرف مائل ہوگئے تھے، پیری میں اردو میں ایک مثنوی لکھی، تو اپنی بزرگانہ شفقت کی وجہ سے سید صاحبؒ سے اس پر ایک دیباچہ لکھوایا۔

(یادِ رفتگاں۔ صفحہ ۲۳۶)

سید سجاد حیدر یلدرم علی گڈھ میں مولانا شبلیؒ کے شاگرد اور مولانا محمد علی جوہر کے ساتھی تھے، اپنی ملازمت کے سلسلہ میں ترکی میں رہے، اس سے ترکی ادب سے ان کو دلچسپی ہوگئی۔ یلدرم تخلص رکھ لیا، جس کے معنی ترکی میں تجلی کے ہیں، سید صاحبؒ پہلی بار ان سے ملے تو یہ ملاقات قریبی روابط کی حد تک بڑھ گئی، ان کو دار المصنفین سے بھی دلچسپی ہوئی، ۱۹۴۳ء میں ان کا انتقال ہوا، تو سید صاحبؒ نے ان کی یاد میں لکھا کہ وہ ہماری زبان میں ایک نئی صنف ادب کے بانی تھے، جس کو ادب لطیف کہتے ہیں، اس لیے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک پایہ ہے، وہ کئی ادبی افسانوں کے مصنف اور ترکی ناولوں کے مترجم ہیں، سید صاحبؒ نے ان کے ذاتی اوصاف کا ذکر اس طرح کیا کہ وہ بڑے متواضع، مرنجاں مرنج، ملنسار، شگفتہ دل، بذلہ سنج، شریف اور نرم طبع تھے، ان کے دوستوں کو ان کی یاد بہت آئے گی۔ (ایضاً ص ۲۴۸)

سید محفوظ علی بدایونی (المتوفی ۱۹۴۳ء) سے سید صاحبؒ کی بے تکلفانہ ملاقاتیں رہتیں، علی گڈھ کے ممتاز طالب علم رہے، مولانا محمد علی جوہر کے زمانہ میں تھے، علی گڈھ منتھلی، اولڈ بوائے، دکن ریویو، نقیب اور ہمدرد اخبار کے دور اول کے ممتاز لکھنے والوں میں تھے، مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ ہمدرد میں رہے، تو تجاہل عارفانہ کے عنوان سے علی گڈھ کے معاملات کے بارے میں مزاحیہ مضامین لکھا کرتے تھے، سرکاری عہدہ کے سلسلہ میں افریقہ بھی گئے، ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے لکھا، کہ اپنے دور کے نامور ادیب ہوئے، سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں طرز کے شگفتہ نگار ادیب تھے، ان میں بڑی دینداری بھی رہی۔ (ایضاً ص ۲۶۹-۲۷۰)

مولانا عبد الرزاق کانپوری اپنی تصانیف البرامکہ اور نظام الدین طوسی کی وجہ سے اپنے زمانہ میں بہت مشہور ہوئے، علامہ شبلیؒ نے ہیروز آف اسلام سیریز میں المامون، اور الفاروق لکھی، تو انھوں نے وزرائے اسلام سیریز کی ابتدا کی، اور اسی سلسلہ میں مولانا شبلیؒ کے یہاں ان کا آنا جانا ہوا، اسی زمانہ میں سید صاحبؒ سے بھی تعلقات پیدا ہوئے، تو دونوں بزرگوں نے ۴۳ برس تک بڑی خوبی سے نباہا، سید صاحبؒ بھوپال میں قاضی القضاہ تھے، تو وہیں مولوی عبد الرزاق کانپوری نے وفات پائی، سید صاحبؒ نے ان کا ماتم، "ماتم گسارِ برامکہ" کے عنوان سے لکھ کر کیا، جس میں لکھا کہ مرحوم بلند بالا، خوش اخلاق اور متواضع تھے، ہر حال میں علمی کاموں میں منہمک رہے، زمانہ کے حالات میں جو انقلاب ہو رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے ایسے شائق و خدمت گذار علم و ادب ہونے کی توقع بہت کم کیجاتی ہے،

مولوی عنایت اللہ بی. اے دہلوی منشی ذکاء اللہ کے بیٹے تھے، سرسید کی نگرانی میں علی گڑھ میں تعلیم پائی، سرسید کے بہت سے علمی کاموں میں اُس زمانہ میں ان کی مدد کرتے رہے، آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کا ترجمہ اردو میں دعوت اسلام کے نام سے کیا، تو بہت مشہور ہوئے، جونپور اور گوالیار میں سرکاری ملازمت کرنے کے بعد دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ناظم مقرر ہو کر وہاں چودہ سال رہے، آخر میں دہرہ دون میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، سید صاحبؒ سے ان کا ملنا جلنا برابر رہا، اس لیے جب ان کی وفات ؁۱۹۴۳ء میں ہوئی، تو انھوں نے معارف میں لکھا کہ وہ غیر زبان کی کتابوں کو اس طرح اردو کے قالب میں ڈھال دیتے، کہ تصنیف کا گمان ہوتا تھا، ان کے چھوٹے بڑے تراجم اور علمی کتابوں کی تعداد پچاس ساٹھ رہی ہو گی، ان کی سب سے اہم علمی خدمت اندلس کا تاریخی جغرافیہ ہے، جو ان کی سالہا سال کی محنت کا نتیجہ ہے، یہ درحقیقت جغرافیہ نہیں ہے، بلکہ ایک حد تک اندلس کی اسلامی فتوحات اور اس کے ابتدائی دور کی تاریخ ہے، (ایضاً ص ۲۷۲)

انگریزی دانوں کے حلقہ میں سید صاحبؒ لاہور کے سر شیخ عبد القادر (المتوفی ؁۱۹۵۰ء) سے بہت متاثر تھے، اللہ سے ان کی واقفیت نصف صدی تک رہی، وہ حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، مگر سید صاحبؒ کی نگاہ میں ان کی قدر اس لیے تھی، کہ ان کو ندوہ کی تحریک سے غیر معمولی دلچسپی تھی، اس کی حمایت میں بقول سید صاحبؒ انوکھے انداز میں تقریر کرتے، آخر آخر وقت تک اس کے رکن رہے، اسی کے ساتھ سید صاحبؒ ان کو اردو کا سب سے بڑا محسن اس لیے تصور کیا، کہ جب انھوں نے ؁۱۹۰۱ء میں اپنا رسالہ مخزن نکالا تو اس کے ذریعہ سے انھوں نے بیسیوں کو ادیب، انشاپرداز، اہل قلم اور شاعر بنا دیا، سید صاحبؒ کا پہلا مضمون اسی رسالہ میں نکلا، ان کی وفات پر اپنی تعزیتی تحریر میں لکھا کہ حق یہ ہے کہ انہی نے ہندوستان کو اقبال بخشا، اور ان ہی کے فیض نے شاہنامۂ اسلام کے مصنف حفیظ جالندھری کو روشناس کیا، سید صاحبؒ ان کی نجی زندگی سے بھی واقف تھے، اس لیے ان کی تعریف یہ لکھ کر بھی کی ہے کہ ان کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی، ہر مجلس اور ہر محفل میں ان کی یکساں قدر و منزلت تھی، وہ نیک طبیعت، نرم مزاج، متواضع اور ملنسار تھے، سر شیخ عبد القادر سے ملنے والوں میں اب بھی کچھ لوگ زندہ ہوں گے، سید صاحبؒ نے ان پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی وہ تصدیق کریں گے۔ (ایضاً ص ۴۰۷-۴۰۸)

مہاراشٹر کے پروفیسر شیخ عبد القادر سرفراز سے سید صاحبؒ کے دوستانہ تعلقات چالیس سال تک رہے، اور جب ان کی وفات ؁۱۹۵۲ء میں ہوئی تو ان کو ایک شریف النفس دوست کہہ کر ان کا ماتم کیا، ان آبائی وطن تو یوپی میں تھا، مگر ان کے والد بزرگوار نے مہاراشٹر کے شہر ناسک کو اپنا وطن بنا یا، تو وہ بھی صوبہ بمبئی یا مہاراشٹر کے ہو گئے، بمبئی اور پھر پونہ کے کالجوں میں مشرقی زبانوں کے استاذ رہے، فارسی زبان میں اپنی قابلیت کے لیے مشہور تھے، ان کو مولانا شبلیؒ سے بڑی محبت تھی، اس تعلق کی بنا پر انھوں نے سید صاحبؒ کو دکن کالج پونہ میں استاد مقرر کر دیا، اسی زمانہ میں دونوں کی گہری دوستی شروع ہوئی، سید صاحبؒ کو اعتراف رہا، کہ ارض القرآن لکھنے میں

ان سے بڑی مدد ملی، وہ جب کراچی منتقل ہوگئے، تو شیخ عبدالقادر نے ان کو یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی وفا آموختی از ما بکارِ دیگراں کردی

سید صاحبؒ نے اس کی کسک محسوس کی، وہ ان سے سن میں پانچ سال بڑے تھے، مگر ان کی وفات پر ان کو دوست ہی کی طرح یاد کر کے اپنے دکھ کا اظہار کیا، کہ افسوس علم فضیلت اور اخلاق واخلاص کا یہ مجسمہ ہماری نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے پوشیدہ ہوگیا، (یادرفتگان۔ صفحہ ۴۴۶)

ہم عصر شعراء کا ماتم سید صاحبؒ سخن ور ضرور تھے، لیکن اپنی سخن وری کی طرف بہت کم توجہ دی، البتہ سخن شناش، سخن دان اور سخن فہم شروع سے آخر تک رہے، اسی لیے اپنے دور کے باکمال شعراء کی قدر دانی میں کسی طرح کمی نہیں کی، بلکہ ان سے ذاتی تعلقات بھی رکھے، اکبر الہ آبادی اور مولانا شبلیؒ میں گہرے مراسم رہے، اسی بنا پر سید صاحبؒ ان کو اپنا بزرگ تسلیم کرتے تھے دونوں میں برابر بزرگانہ اور عزیزانہ خط وکتابت ہوتی رہی، ۱۹۲۱ء میں ان کی وفات ہوئی، تو سید صاحبؒ نے بہت مغموم ہو کر "غم اکبر" کے عنوان سے معارف میں لکھا کہ ہماری زبان کا زندہ دل شاعر اس دنیا سے چل بسا، اس گلستاں نما خزاں آباد کی بہتر بہاریں اس کی آنکھوں نے دیکھیں، اس کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا اہم واقعہ گذرا ہو جس کو اپنے کاشانۂ خیال میں اس نے جگہ نہ دی ہو، زبان خلق نے اس کو "لسان العصر" کا خطاب دیا، اس سے بہتر لقب اس کے لیے دوسرا نہیں ہو سکتا تھا، اس میں تین صفتیں ایک ساتھ جمع تھیں، وہ فطری فلسفی، پاک مشرب صوفی، اور زندہ دل شاعر تھا، اس کا نمک ظرافت ہمارے عیوب کے زخموں پر کسی قدر تیز چرکا لگاتا تھا، تاہم ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ درحقیقت نمک نہیں مرہم تھا، (ایضاً ۴۲) ان چند سطروں میں اکبر الہ آبادی کے تمام شاعرانہ کمالات سامنے آگئے ہیں،

جناب میر علی محمد شاد عظیم آبادی نے بیاسی سال کی عمر میں ۱۹۲۷ء میں وفات پائی، سید صاحبؒ کو ان سے اپنی ہم وطنی کے باوجود ملاقات کرنے کا موقع نہیں ملا، مگر مراسلت برابر جاری رہی،

ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے ان کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف اس طرح کیا، کہ ساٹھ برس سے زیادہ مشق سخن تھی، لاکھوں اشعار ان کے نتائج فکر ہیں، میر اور انیس کے مقلد اور متبع تھے، اس دور میں وہ پورب میں زبان اردو کے تنہا استاد رہ گئے تھے۔ (یادرفتگاں صفحہ ۷۷)

حضرت گرامی رہنے والے تو ضلع جالندھر کے تھے، مگر فارسی کے مسلم الثبوت شاعر ہونے کی وجہ سے نظام حیدر آباد کے دربار کے فارسی شاعر ہوگئے تھے، حفیظ جالندھری اور جناب سالک ان کے شاگردوں میں تھے، علامہ محمد اقبال بھی ان کو اپنا فارسی کلام دکھاتے تھے، حیدر آباد کے قیام میں مولانا شبلیؒ کا بھی ساتھ رہا، اسی تعلق سے سید صاحبؒ ان سے ملتے رہے اور انھوں نے بھی ان سے بزرگانہ برتاؤ رکھا، دونوں میں برابر خط وکتابت بھی رہی، ۱۹۲۷ء میں ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے معارف میں لکھا کہ افسوس اب کشور ہند ایسے یگانہ نامور وجود سے خالی ہوگیا، (ایضاً ص ۹۷)

حافظ فضل حق آزاد اصلاً گیا ضلع کے رہنے والے تھے، مگر مستقل سکونت عظیم آباد پٹنہ میں اختیار کر لی تھی، ان کو ندوہ کی تحریک سے دلچسپی تھی، اس لیے سید صاحبؒ مولانا شبلیؒ کی معیت میں ان سے برابر ملتے رہے، جب ان کی وفات ۱۹۴۲ء میں ہوئی تو سید صاحبؒ اپنی مبصرانہ تحریر میں ان کے متعلق لکھا، کہ مرحوم فطری شاعر تھے، کسی استاذ سے کبھی اصلاح نہیں لی، مشکل قافیوں اور ردیفوں کا شوق تھا، زبان، محاورات اور روزمروں کے بجائے دقیق مضامین ومعانی کا شوق زیادہ تھا، اس لیے مشکل الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز نہ تھا طبیعت میں ذکاوت اور ذہانت تھی، اس لیے آپ اپنا راستہ پیدا کرنے کی دھن تھی، تقلید عام سے نفور تھا، جوانی میں شاد عظیم آبادی سے بھی بھڑ گئے تھے، (ایضاً ص ۲۳۸)

وصل بلگرامی سے سید صاحبؒ سے پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء میں ہوئی، جس کی گرم جوشی

ان کی وفات ۱۹۴۳ء تک رہی، وہ بڑے اچھے شاعر اور ادیب تھے، مگر سید صاحبؒ ان کے شعری و ادبی کارناموں سے زیادہ ان کی ذاتی خوبیوں کے زیادہ مداح رہے، اس لیے ان کے متعلق ان کی وفات کے بعد لکھا کہ وہ بڑے ملنسار، متواضع، پُر محبت، دوستوں کے فداکار اور وقت پر ہر ایک کے کام آنے والے تھے، ہمیشہ سے دیندار اور پابند وضع رہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت بھی ہو گئے تھے، اور ان ہی کی خانقاہ میں وفات پائی۔ (یادِ رفتگان صفحہ ۲۳۹)

خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب (المتوفی ۱۹۴۴ء) سید صاحبؒ کے خواجہ تاش تھے، وہ سید صاحبؒ کے محبوب طریقت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے محبوب بنے رہے۔

اسی لیے سید صاحبؒ نے ان کی وفات پر جو کچھ لکھا، اس میں ان کی انشراحی کیفیت چھائی ہوئی ہے، ان کی بہت سی خوبیاں بیان کر کے ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے، رقم طراز ہیں، کہ وہ فطری شاعر تھے، کسی کے تلمذ نہ تھا، تلمیذ الرحمٰن تھے، اول تو شاعری کا سنجیدہ اور فطری مذاق اس پر تصوف کی چاشنی اور اس میں جگ بیتی نہیں بلکہ اپنی کہانی سب مل ملا کر ان کی شاعری اپنے زمانے کی شاعری کا بے مثال نمونہ تھی، جب وہ اپنا شعر سنانے پر آتے، تو ایک غزل دو غزل بلکہ بیسیوں غزل سنا ڈالتے تھے، اس کی ان کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ کون اس کو سن رہا ہے، اور کون داد دے رہا ہے، وہ اپنے اشعار سے آپ لطف اندوز ہوتے اور جھومتے تھے، اہل ادب نے لکھا ہے کہ خطابت اور شاعری میں فرق یہ ہے کہ خطیب کی نظر اپنے اوپر نہیں سامعین پر ہوتی ہے، اور شاعر کو سامع سے نہیں، بلکہ اپنے آپ سے بحث ہوتی ہے، وہ آپ ہی کہتا اور آپ ہی سنتا ہے، وہ اپنی شراب سے آپ مست اور اپنی بانسری پر آپ جھومتا ہے، شاعری کی یہ تعریف پوری طرح خواجہ پر صادق آتی تھی، (ایضاً ص ۳۱۰) یہ تبصرہ مختصر ہے، لیکن کیسا پاکیزہ اور جاندار ہے، دل کی گہرائیوں سے لکھا گیا ہے، اس لیے پڑھنے والوں کے دلوں سے بھی ٹکرائے گا، اس پوری ماتمی تحریر میں دل کی یہی ساری کیفیات چھائی ہوئی ہیں۔

چودھری خوشی محمد ناظر (المتوفی ۱۹۴۴ء) لائل پور ضلع کے ایک گانوں کے رہنے والے تھے علی گڑھ میں تعلیم پائی، مولانا شبلیؒ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، مگر ان کی شاعری کو مناسبت مولانا حالیؒ سے ہوئی اور ان ہی سے اصلاح لی، کشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، وہاں کی فرح بخش آب و ہوا، اور قدرتی مناظر نے ان کی شاعری کے لیے بہترین مواقع فراہم کیے، سید صاحبؒ سے ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ مولانا شبلیؒ کے تعلق سے ان سے محبت اور شفقت سے پیش آتے رہے، سید صاحبؒ نے بھی اس کی قدر کی، اور جب ان کی وفات ہوئی، تو انھوں نے ان کو اپنے دور کا نزالا شاعر کہہ کر ان نوجوانوں کو ان کی شاعری سے سبق لینے کی تلقین کی جو اپنی نوجوانی میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہی ادب کو زندگی سے پہلی دفعہ وابستہ کر رہے ہیں، چودھری خوشی محمد ناظر کے شعری کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کشمیر میں اسی مجلس مفرح القلوب کے ذریعہ شعر و سخن کے ترانے بلند کئے، مناظر قدرت کی تصویر کشی میں ان کے قلم میں بے مثال جولانی تھی، پھر عشق الٰہی اور عشق نبویؐ پر ان کی نظمیں ان کے مومن دل کی پوری شہادت دیتی ہیں، (ایضاً ص ۳۱۹-۳۲۰)

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ (المتوفی ۱۹۴۶ء) کی شاعری کا سکہ سید صاحبؒ کے دل پر ان کے فرزند صدیق حسن کی وجہ سے بیٹھا، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کے ساتھ تھے، ان کی وفات پر جو تحریر لکھی اس میں اپنے ابتدائی دور کے ذوقِ شعری کا بھی ذکر کر گئے ہیں، اس زمانہ میں وہ امیر مینائی کے بڑے دلدادہ تھے، جلیل ان کے شاگرد تھے، اس لحاظ سے بھی ان کی طرف مائل ہوئے، امیر مینائی کے ساتھ وہ بھی حیدر آباد گئے، اپنے استاد کی وفات کے بعد وہ حیدر آباد ہی میں رہے، اور میر عثمان علی خان نظام حیدر آباد کے استاذ کی حیثیت سے وہیں وفات پائی، سید صاحبؒ جب جب حیدر آباد گئے، ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوئے، وہ لکھتے ہیں، کہ ان کی وضعداری کا یہ حال تھا کہ پہلی ملاقات جس مکان، جس سائبان، جس کرسی اور جس ہیئت کذائی سے کی، ہر ملاقات میں اسی وضعداری

سے ملے۔ سید صاحبؒ ان کے گرویدہ اس لیے بھی تھے، کہ وہ نہایت دیندار، تہجد گذار تسبیح خواں اور ذکر الٰہی میں تر زبان تھے۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھا کہ آج شاعر بہت ہیں مگر استاد کم ہیں، جو فن کے مسائل پر کامل عبور رکھتے ہوں، جو لفظوں کے ہاتھوں میں نہ ہوں، بلکہ لفظ ان کے ہاتھ میں ہوں، جس کے کلام سے زبان کے الفاظ، محاورات اور امثال کی تصدیق ہو، جس کا دیوان زبان کے سکوں کی ٹکسال ہو، حضرت جلیل اس دور کے جو میر و مرزا سے شروع ہوا تھا، بظاہر خاتم معلوم ہوتے ہیں، اب نیا زمانہ ہے، نئی شاعری ہے، نیا ذوق ہے، نئے خیالات ہیں، پرانے قاعدے توڑے جا رہے ہیں، پرانے اصول مٹ رہے ہیں، تشبیہوں اور استعاروں تک میں بے اصولی آرہی ہے، اشعار میں کمی بیشی ہو رہی ہے، اور بحور کے دریا میں بھی تلاطم برپا ہے، ہر دور شاعر اور ہر دور بادشاہ میں جو تلازم عہد عباسیہ میں شروع ہوا تھا، اس کو حضرت جلیل اور میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد پر اب تمام سمجھئے۔ (ایضاً ص، ۳۳) یہ کیسا جاندار اور باوقار تبصرہ ہے، جو آج کل شاعروں کے غور و فکر کے لائق ہے،

عبدالرحمٰن شاطر مدراسی | مولانا عبدالرحمٰن شاطر سے اس لیے قریب تر اور متاثر رہے، کہ وہ حیدر آباد میں مولانا شبلیؒ کے ساتھ وہاں کی علمی و ادبی مجلسوں میں شریک رہتے تھے، اس کے علاوہ مولانا شبلی نے ان کے ایک طویل رائیہ قصیدہ کی بڑی تعریف کی تھی، جس میں فلسفیانہ خیالات بڑی برجستگی سے ادا کیے گئے ہیں، اور بقول مولانا شبلیؒ ایسی مثالیں اردو میں کم ملتی ہیں۔

حضرت سید صاحب مدراس میں ان سے برابر ملتے رہے، اور گویا ان سے گھریلو تعلقات ہوگئے تھے، ان کی نظمیں معارف میں بھی شائع کیں، جب ان کی وفات اپریل ۱۹۴۳ء میں ہوئی تو ان کو یاد کر کے تحریر فرمایا کہ " ارکاٹ، احاطۂ مدراس میں اسلامی علم و تمدن کی فراموش شدہ تاریخ کا ایک ورق ہے، نواب ارکاٹ کا محل ارکاٹ کے جنگی خاتمہ کے بعد خود شہر مدراس ہے،

شمس العلماء عبدالرحمٰن شاطر اسی برج فلکی کے آفتاب تھے، اور پھر آخر میں لکھتے ہیں" دکن میں مولانا شاطر جیسے اردو کے حکیم شاعر کا وجود اس زبان کی عالمگیری کی دلیل قاطع تھی، جس نے چالیس برس تک اہل دکن کو اپنی خوش نوائیوں سے مسرور و محظوظ رکھا، افسوس کہ اس سرزمین دکن کا یہ بلبل شیریں نوا اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ (یادِ رفتگان، صفحہ ۲۵۰- ۲۴۹)

مشاہیر کا ماتم | سید صاحبؒ کے زمانہ میں ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی میں ایسے ایسے باکمال افراد گذرے کہ جس طرف نظر اٹھتی، ان کے کارناموں سے ذہن متاثر ہو جاتا، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، سید صاحبؒ اور ان کے ہم عصروں کو ایک زریں دور میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملا، سید صاحبؒ ان تمام باکمال صحاب کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے، اور ان کی وفات پر دکھ بھری تحریریں لکھ کر ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

نواب وقار الملک سے وہ اپنی کم عمری اور طالب علمی کے زمانہ سے مولانا شبلی کی وساطت سے ملتے رہے، اور جب جب ملے ان کی خاکساری، فروتنی، سادگی، تواضع، طالب علموں سے مہر و محبت اور کردار کی پختگی سے پہلے زیادہ متاثر ہوئے، ان کے کیرکٹر کی پختگی کا ذکر یہ لکھ کر کیا ہے کہ وہ شروع میں سرسید کی ماتحتی میں ملازم ہوئے، اس لیے ان کو سرکار کہا کرتے تھے، اور جب حیدر آباد جا کر وہاں وقار الملک ہوگئے، تب بھی ان کو سرکار ہی کہہ کر ان سے مودبانہ ملتے تھے، مگر سرسید نے اپنے لڑکے سید محمود کو ایم۔ اے۔ او کالج میں اپنا جانشین بنایا تو انھوں نے سرسید کو نہایت صفائی سے لکھا کہ اسلام میں دو ہی شخص گذرے ہیں، ایک معاویہ کہ انھوں نے یزید کو اپنا جانشین بنایا، اور ایک آپ جو محمود کو جانشین بنا رہے ہیں، ۱۹۱۷ء میں ان کی وفات ہوئی، تو ان کا ماتم کرتے ہوئے لکھا۔

نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا، مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلیؒ کی موت پر ہم نے علم کا نقدان پر نوحہ کیا،

لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں، اور اولو العزمانہ اخلاق کی گمشدگی پر فریاد" (یادِ رفتگاں۔ صفحہ ۳۱)

ان چند سطروں میں ماتم گساری کا نہ صرف ایک عمدہ نمونہ ملتا ہے، بلکہ وقار الملک کی زندگی کی مرقع آرائی ہو جاتی ہے،

جسٹس سید کرامت حسین لکھنؤ کے رہنے والے تھے، اپنی ملازمت کے مختلف مدارج طے کرکے آخر میں الہ آباد کے ہائی کورٹ کے جج ہو کر ریٹائر ہوئے، ۱۹۱۷ء میں ان کا انتقال ہوا، وہ دار المصنفین کے نائب صدر بھی رہے، اس تعلق کی بنا پر سید صاحب کا برابر ملنا جلنا رہا، ان کی وفات پر اپنی تعزیتی تحریر میں لکھا، کہ ان کو فلسفہ کا خاص ذوق تھا، انھوں نے جدید فلسفہ کو اردو میں لکھنے کی ابتدا کی آخر میں ایک ضخیم کتاب المرآۃ کے نام سے عورتوں کے حقوق اور خصائص پر لکھ رہے تھے، (ایضاً ص ۳۶)

نواب عماد الملک (المتوفی ۱۹۲۶ء) اپنی زندگی کے مختلف مدارج طے کرکے حیدرآباد کی ریاست کے وزیر اعظم ہو گئے تھے، اس عہدہ کے زمانہ میں انھوں نے پورے ہندوستان میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی، مولانا شبلیؒ سے ان کے گہرے تعلقات تھے، اس بنا پر سید صاحب ان سے اپنی کم عمری کے زمانہ سے ملتے رہے، ان کی ایک نصیحت سے سید صاحب کی علمی زندگی کا رنگ بدل گیا، جب مولانا شبلیؒ کی وفات ہوئی، تو سید صاحب نے ان پر ایک نوحہ لکھا، اور اس کو نواب عماد الملک کی خدمت میں ارسال کیا، اس کو پڑھ کر انھوں نے سید صاحب کو لکھا کہ عرفی ہنر اس وقت تک نہیں کرنا چاہئے، جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اب اس ہنر میں میرا کوئی حریف نہیں، سید صاحب لکھتے ہیں۔ کہ یہ نکتہ میرے لیے رہنما ثابت ہوا، دار المصنفین کی تاسیس میں انھوں نے ہر طرح کی مالی امداد کی، اور اس کے صدر بھی ہوئے، اس لیے سید صاحب کو ان سے گہرا لگاؤ رہا، ان کی وفات پر لکھ کر ماتم کیا کہ وہ انگریزی زبان کے بڑے عالم اور دوسری طرف مشرقی علوم و فنون میں مہارت

رکھتے تھے، ان کے نصاب، قیام اور اشاعت میں نہایت دلچسپی اور ہمدردی کے ساتھ ہر ممکن اعانت کے لیے آمادہ رہتے، دائرۃ المعارف، دار المصنفین، ندوہ، مسلم یونیورسٹی، غرض اس وقت قدیم و جدید علوم و فنون کے جس قدر مرکز ہندوستان میں قائم ہیں، سب کے سب ان کی علمی اعانت اور سرپرستی کے ممنون تھے، ان کے در و دیوار سے ایک مدت تک ان کے ماتم کی صدائے بازگشت آتی رہے گی، (یادِ رفتگان۔ صفحہ ۶۷)

سید صاحب ایک دینی مدرسہ کے عالم ہونے کے باوجود انگریزی تعلیم یافتہ اہل قلم اور اہل علم سے ملنے ملانے میں پرہیز نہ کرتے، بلکہ ان سے شوق سے ملتے، اس لیے مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کے متعلق کہا تھا، کہ یہ علماء اور انگریزی تعلیم یافتوں کے درمیان سفیر اور متوسط کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جسٹس سید امیر علی (المتوفی ۱۹۲۸ء) اپنی دو تصانیف اسپرٹ آف اسلام ہسٹری آف سارا سنس کی وجہ سے اب تک مشہور رہیں، وہ شیعہ تھے، اس لیے بعض اوقات کچھ ایسی باتیں لکھ جاتے جن سے سنیوں کو اتفاق نہ ہوتا، سید صاحب بھی ان کے بعض خیالات سے اختلاف رکھتے تھے، مگر وہ ۱۹۲۰ء میں لندن گئے تو ان سے برابر ملتے رہے، ان کی وفات پر جو تحریر لکھی، اس سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے ان کی خوبیوں کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ اس کا اعتراف کیا ہے۔ کہ انھوں نے یورپ میں اسلام کی بڑی خدمت کی، اور ان کے قلم کی ضوفشانی سے اسلام کے متعلق یورپ کے بہت سے خیالات باطلہ کے بادل چھٹ گئے"۔ (ایضاً ص ۸۶)

صاحبزادہ آفتاب احمد خان (المتوفی ۱۹۳۰ء) سرسید کی تعلیمی تحریک کے بہت بڑے موید تھے، بیرسٹری کی تعلیم پائی تھی، اس سے رغبت نہیں ہوئی، برطانوی حکومت کی طرف سے انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوئے، جو اس زمانہ میں بڑا سیاسی اعزاز سمجھا جاتا تھا، وہاں سے آئے، تو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے انھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو بڑی ترقی دی سید صاحب انکے اوزار سے عمل کیساتھ انکے اس خیال کے

قدرداں رہے، کہ ان کا دل پسند فلسفہ یہ تھا، کہ مسلمان عبدیت اور نیابت الٰہی دونوں کے درمیان تطبیق دیں، یعنی ایک طرف تو وہ اپنے کو اللہ کا لاچار بندہ سمجھیں، دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی خلافت و نیابت سے سرفراز ہو کر پورے عالم اسلام اور کل قوائے عالم پر اپنے علم کے زور سے حکمرانی کریں۔ (یادِ رفتگان، صفحہ ۹۵)

صلاح الدین خدا بخش (المتوفی ۱۹۳۱ء) پٹنہ کی مشہور اورینٹل لائبریری کے بانی خدا بخش خان کے بیٹے تھے، بیرسٹری کرتے، انگریزی کے بڑے اچھے اہل قلم تھے، جرمن مستشرقین کی بعض کتابوں کے ترجمے انگریزی میں کیے، مگر ان کتابوں میں اسلام سے متعلق جو کچھ بھلی بری یا زہریلی باتیں ہوتیں، ان کو اپنے ترجمہ میں اسی طرح رہنے دیتے، اس لیے ایک موقع پر ان کی سخت مخالفت ہوئی جس کے لیے ان کو مسلم آوٹ لک لاہور میں معذرت نامہ شائع کرنا پڑا، اسی کے بعد ان کی وفات ہو گئی، سید صاحبؒ نے اپنی تعزیتی تحریر میں ان کے لیے کیسی عمدہ بات یہ لکھ دی ہے کہ کس کو خبر تھی کہ ان کا یہ معذرت نامہ حقیقت میں ان کی پوری عمر کا آخری توبہ نامہ ہوگا۔ (ایضاً ص ۱۳۸)

خواجہ کمال الدین (المتوفی ۱۹۳۲ء) احمدی تھے، اس کے باوجود علامہ شبلیؒ ان کے قدرداں رہے، سید صاحبؒ کے بھی ان کے تعلقات ۱۹۱۲ء سے شروع ہوئے، مذہبی تحریکات کے سلسلہ میں ان سے خط و کتابت کی، ان کی وفات پر انھوں نے لکھا کہ خواجہ صاحب کے بہت سے خیالات سے اتفاق نہیں، تاہم یہ کہنا اظہار واقعہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک کی پوری زندگی یورپ میں اسلام کی تبلیغ اور اس کے محاسن کی اشاعت میں صرف کی نیز یہ کہ ان کی تصانیف کے بڑے حصہ کا موضوع احمدیت نہیں، محمدیت ہے، سید صاحبؒ کے اس خیال سے ان کی رواداری کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ (ایضاً ص ۱۵۰)

پٹنہ کے سر علی امام (المتوفی ۱۹۳۲ء) اپنے زمانہ میں بہت ہی کامیاب بیرسٹر تھے، ہندوستان

کی سیاست میں بھی بڑی ناموری حاصل کی، وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل کے ممبر بھی ہوئے، شروع میں مسلم لیگ اور آخر میں کانگریس کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا، بڑے اچھے مقرر تھے، سید صاحبؒ سے ان کے ذاتی تعلقات تو نہ تھے، مگر وہ ان کی عظمت اور رتبہ سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے انکی وفات پر لکھا کہ انگریزی تعلیم کے ایک بہترین نمونہ تھے، اس رائے کی تائید ان کے جاننے والے بھی کریں گے۔ (یادِ رفتگان۔ ص ۱۴۲)

پٹنہ ہی کے سر فخر الدین (المتوفی ۱۹۳۳ء) انگریزوں کے زمانہ میں بہار کے وزیر تعلیم رہے، اپنی فیاضی، مشرقیت پسندی، اور دینداری کی وجہ سے عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، سید صاحبؒ سے براہ راست راہ و رسم قائم نہ تھی، لیکن وہ ان کے رتبہ شناس تھے، اس لیے ان کی وفات پر بڑے دکھ اور درد کے ساتھ لکھا کہ سر علی امام کی وفات پر تدبر و سیاست کا ماتم ہوا، ان کے بھائی حسن امام کے مرنے پر قانون دانی کا نوحہ پڑھا گیا، لیکن سر فخر الدین کی رحلت پر انسانیت اور اس کی شرافت کا ماتم ہے، ان دو تین سطروں میں کیسی دل سوزی ہے۔ (ایضاً ص ۱۴۹)

ضلع کرنال (پنجاب) کے سر حاجی رحیم بخش (المتوفی ۱۹۳۵ء) عربی و فارسی کے ایک معمولی مدرس کی حیثیت سے ترقی کر کے بھاولپور کی مجلس نیابت کے صدر مقرر ہوئے، حکومت برطانیہ کی طرف سے سر کا خطاب پایا، وہ ندوۃ العلماء کے سرپرست بھی رہے، تبلیغی کاموں میں اپنی دولت صرف کی، سید صاحبؒ نے ان پر جو تعزیتی تحریر لکھی ہے، اس سے اندازہ ہوگا، کہ وہ ان کی اس بات سے متاثر تھے، کہ وہ اپنے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچنے پر اپنی پرانی زندگی کو نہیں بھولے، اور اپنی حاصل کی ہوئی نعمت کے شکرانہ میں دینی اور قومی خدمت میں لگے رہے، ایسی مثالیں کم ملیں گی۔ (ایضاً ص ۱۵۲)

سر فضل حسین (المتوفی ۱۹۳۶ء) پنجاب کے مشہور لیڈر تھے، وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل کے

رکن رکین بھی رہے، اپنی دانائی، عزم، حسن تدبیر اور دلائل سے پوری کونسل پر چھا گئے تھے، سید صاحب ان سے کبھی نہیں ملے، مگر ان کے جوہر شناس تھے، جیسا کہ ان کی وفات پر ان کی تعزیتی تحریر سے ظاہر ہے، جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں، کہ مرحوم کے سیاسی مسلک سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر ان کی قابلیت، تدبر، بے خوفی، دلیری، ہردلعزیزی اور قومی بہی خواہی سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، وہ ان حکومت پسندوں میں نہ تھے، جو اپنی شخصی ترقی کو صرف اپنی خاندانی ترقی کا زینہ بناتے ہیں، بلکہ ان میں تھے، جو حکومت کا ساتھ دے کر اپنی سمجھ کے مطابق قوم و ملک کی بھلائی کرتے ہیں، انکی زندگی کا کتنا جاندار تجزیہ ہے۔ (یادِ رفتگاں۔ صفحہ ۱۷۰)

سر راس مسعود (المتوفی ۱۹۳۷ء) اپنے نامور دادا سر سید کے پوتے اور نامور باپ جسٹس محمود کے بیٹے تھے، انگلستان میں تعلیم پاکر ہندوستان واپس ہوئے تو بہار اور اڑیسہ کے محکمۂ تعلیم میں استاد رہنے کے بعد حیدرآباد میں ناظم تعلیمات ہوئے، پھر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں وائس چانسلر کی حیثیت بلائے گئے، آخر میں بھوپال کے وزیر تعلیم تھے، ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے شاہ نادر خان نے چند ماہرین تعلیمات کو اپنے یہاں مدعو کیا، تو سید صاحب اور علامہ محمد اقبال کے ساتھ وہ بھی تھے، سید صاحب نے اس سفر میں ان کو بہت قریب سے دیکھا، اور ان کی مجلسی خوبیوں کو کبھی نہیں بھولے، اسی لیے ان کی وفات پر بڑے رنج و غم کے ساتھ لکھا کہ مسلمانوں کو عموماً اور ان کے دوستوں کیلئے خصوصاً یہ سانحہ بہت ہی المناک ہے، وہ بوجھے وجیہ، کشیدہ قامت، سرخ و سفید، ہنس مکھ اور ملنسار تھے، جس مجلس میں ہوتے سب پر چھا جاتے، باتوں کے دھنی اور زبان کے میٹھے تھے، ہر شخص کے ساتھ جھک کر ملتے تھے، جاپان کا تعلیمی نظم و نسق، انتخاب زریں (اردو اشعار کا انتخاب) بعض رسائل اور مضامین ان کی علمی و ادبی یادگاریں ہیں۔ (ایضاً ص ۱۷۸)

شیخ مشیر حسین قدوائی (المتوفی ۱۹۳۱ء) ضلع بارہ بنکی (یو۔پی) کے ایک گانوں گدیہ کے

تعلقہ دار تھے، بیرسٹری کی تعلیم پائی، سید صاحب ان کی قدر اس لیے کرتے رہے، کہ وہ اسلام کے پرجوش سپاہی اور اتحاد اسلامی کی تحریک کے بانیوں میں تھے، سید صاحب وفد خلافت کے ساتھ لندن میں تھے، تو وہ ارکین وفد سے برابر ملتے رہے، سید صاحب پر اس حیثیت سے بھی ان کا اثر پڑا، کہ وہاں نمازوں کی پابندی کیا کرتے، اور وضو و طہارت کا بڑا اہتمام رکھتے، وہ ندوہ کے بھی رکن تھے، ان کی کتاب "اسلام اور سوشلزم" بہت مقبول ہوئی، سید صاحب نے ان کی وفات پر جو یہ لکھا کہ عمر بھر فرنگستان کی وادیوں میں اپنے قلم سے مصروف جہاد رہے، اس سے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوگا۔ (یادِ رفتگان۔ صفحہ ۱۸۰)

علی گڈھ کے نواب سر مزمل اللہ خان (المتوفی ۱۹۳۸ء) کی وفات پر سید صاحب نے ان کو یو۔پی کا حاتم طائی کہا ہے، اور انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، ایجوکیشنل کانفرنس، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، الہ آباد یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی بنارس، دارالعلوم دیوبند، جمعیۃ العلماء اور کانگریس کو جس طرح اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کیا، اس کی تفصیل لکھ کر ان کی سادگی یہ دکھائی ہے، کہ ٹین آنے گز کے کپڑے کا کرتہ پہننے میں جھجھک محسوس نہ کرتے، اور ہر لمحہ اپنے نیک عمل کے قبول ہونے کے خواہاں رہے، سید صاحب نے یہ سب کچھ لکھ کر متمول لوگوں کو توجہ دلائی ہے، کہ امارت اور دولت کا مصرف کس طرح لینا چاہیے، (ایضاً۔ ص ۱۸۵)

حیدرآباد کے نواب اختر یار جنگ (المتوفی ۱۹۴۰ء) نے معتمد امور مذہبی کی کارکردگی کی وجہ سے نظام حیدرآباد سے خطاب پایا، سید صاحب نے ان کے سیکڑوں مفید خدمات کا ذکر اس لیے کیا ہے، کہ یہ سبق حاصل ہو، کہ نیک کام کی امداد میں سبقت کیسے کیجا سکتی ہے، (ایضاً ص ۲۰۶)

سر شاہ سلیمان (المتوفی ۱۹۴۱ء) اعظم گڈھ ضلع ہی کے رہنے والے تھے، انکے مورث اعلیٰ شمس بازغہ کے مصنف ملا محمود جونپوری تھے، ان کو ایک طرف تو قصائد ذوق سے دلچسپی رہی،

دوسری طرف آئنسٹائن کے نظریہ کا بھی مطالعہ کرتے رہے، پھر ہائی کورٹ الہ آباد کے چیف جسٹس اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے، ان کی وفات پر ماتم کرتے ہوئے ان کے محاسن سید صاحبؒ نے اس لیے دکھائے ہیں، کہ مسلمانوں میں جو لوگ نئی تعلیم پاکر کچھ کمالات حاصل کرتے ہیں، ان کا اعلیٰ ظرف کیا ہونا چاہیے۔ اس لیے ان کی سیرت کی خوبیاں اس طرح بیان کی ہیں، کہ نئی تعلیم کے جو بہتر سے بہتر نمونے ہماری قوم نے پیش کیے، ان میں سے ایک سر شاہ سلیمان تھے، وہ ایماناً اور عملاً مسلمان تھے، ان تنگ ظرفوں میں نہ تھے، جو رومن حروف کے چند الفاظ پڑھ لینے کے بعد اپنے کو حقائق و معارف کا سب سے بڑا عارف مان کر دین و مذہب سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور بندگی کی حد سے آگے بڑھ کر خدائی کے عرش کا اپنے کو مستحق سمجھتے ہیں، وہ منکسر المزاج، متواضع حلیم اور سادہ مزاج تھے، اپنی رائے کے مضبوط اور کام کے دھنی تھے، وہ عالم تھے، مگر عمر بھر طالب علم بنے رہے، وہ ہندوستان کا وقار اور مسلمانوں کا فخر تھے، (یادِ رفتگاں، صفحہ ۲ - ۲۲۳)

حیدر آباد کے صدر اعظم سر اکبر حیدری (المتوفی ۱۹۴۳ء) کی وفات پر سید صاحبؒ نے جو تحریر لکھی، اس میں ان سے اپنی قدردانی کا اور ان کی وفات پر اپنے غم و الم کا اظہار اس لیے کیا کہ وہ صدر اعظم کی حیثیت سے تمام اسلامی اداروں سے ایک خاص مربیانہ تعلق رکھتے تھے، یہ گویا اس کا پیام ہے کہ جو اعلیٰ عہدہ دار علمی و تعلیمی اداروں کی سرپرستی کریں گے، وہ قدردانی کے مستحق ہوں گے‘‘ (ایضاً ص ۲۲۵)

حیدر آباد کے نواب محمد یار جنگ بہادر (المتوفی ۱۹۴۲ء) وہاں کے ایک صوبہ دار تھے دارالمصنفین سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، اس لیے سید صاحبؒ ان سے برابر ملتے رہے، ان کی وفات پر ان کا ملول ہونا بالکل فطری تھا، ان کا ماتم یہ لکھ کر کیا کہ وہ ایک مرنجان مرنج بزرگ، نہایت مخلص، بے ریا، باخدا، اور نیک طبع تھے، نیز علمی اور تعلیمی تحریک میں شریک رہے، ان کی ان خوبیوں کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں سے مسلمانوں کی معاشرت بن سکتی ہے، (ایضاً ص ۲۳۲)

مراد آباد کے سر محمد یعقوب (المتوفی ۱۹۴۲ء) اپنے زمانہ کے بہت ہی خوش قسمت لوگوں میں تھے، دہلی کے لجسلیٹو اسمبلی کے صدر بھی ہوئے، سر کا خطاب بھی پایا، حکومت نظام کے مشیر اصلاحات بھی ہوئے، سید صاحبؒ شاید ان سے کبھی نہیں ملے، لیکن ان کو دور سے لگاؤ اس لیے رکھا کہ ان کے والد ماجد مولوی محمد اسماعیل وکیل شاہجہانپور ندوہ کے رکن اور تبلیغی تحریک میں مولانا شبلیؒ کے ساتھ تھے، اسی وضعداری میں ان کی وفات پر لکھا کہ انھوں نے دنیا میں ترقی اپنی خوش قسمتی سے کی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عالم میں بھی ان کو خوش قسمت بنائے، سید صاحبؒ کی نظر میں ان کی دنیاوی کامیابی کی وجہ یہ بھی تھی، کہ وہ بہت خوش خلق، متواضع متحمل اور حاجت مندوں کی امداد میں کشادہ دست تھے، ان محاسن کا ذکر سید صاحبؒ نے شاید اس لیے کیا، کہ ان خوبیوں کے ساتھ ایک آدمی خوش قسمت اور کامیاب بھی ہو جائے تو تعجب کی بات نہیں، اس لیے ان کا ذکر شرافت اخلاق کے ساتھ کرتے ہیں، (ایضاً ص ۲۴۳)

سید صاحبؒ جس سے گہرا لگاؤ رکھتے، اس کی وفات پر اپنی تعزیتی تحریر لمبی لکھتے، اپنے معاصر سید حسین کی موت پر بھی ایک طویل تحریر لکھی ہے، سید حسین بنگال کے مشہور ظریف انشاپرداز سید محمد آزاد کے چھوٹے بیٹے تھے، انگلستان میں تعلیم پائی، تو انگریزی زبان لکھنے میں بڑی مہارت حاصل کی، خاندانی روایات کی وجہ سے اردو لکھنے کا اچھا ذوق پایا، سیاست میں حصہ لینے لگے تو پنڈت موتی لال نہرو کے اخبار انڈپنڈنٹ الہ آباد کے اڈیٹر ہوئے، جب ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کا وفد خلافت لندن گیا تو مولانا محمد علی اور سید صاحبؒ کے ساتھ وہ بھی تھے، وہاں جاکر خلافت کے سلسلہ میں مولانا محمد علی نے مسلمانوں، سید صاحبؒ نے دین اسلام اور سید حسین نے ہندوستانیوں کا نقطۂ نظر پیش کیا، لندن کے قیام میں مولانا محمد علی اور سید حسین میں جو نوک جھونک ہوتی، اس کو سید صاحبؒ جس طرح رفع کرتے وہ ان کی شرافت طبع کی ایک مثال ہے، سید صاحبؒ نے لکھا ہے کہ

محمد علی اور سید حسین دونوں ہی لائق اور قابل تھے، یہ دونوں اپنی اپنی جگہ اٹل اصول اور عمل رکھتے تھے، اس لیے ان دونوں شیروں کو تھپک تھپک کر رکھنا بڑا مشکل کام تھا، یہ کام اس کو کرنا پڑتا تھا، جو دونوں کے بیچ میں واو عطف کی طرح تھا، تاہم کام کی اہمیت کا خیال کرکے دونوں نے جس طرح بنا آٹھ مہینے کی مدت کو خیر و خوبی کے ساتھ نباہا۔

اس مدت کو خیر و خوبی سے نباہنے میں، سید صاحبؒ کی شرافت طبع بہت معاون ثابت ہوئی، مگر انھوں نے اپنے عجز و انکسار میں اس کی تفصیل لکھ کر اپنی بڑائی کا اظہار پسند نہیں کیا، بلکہ ایک عاجزانہ تحریر لکھ کر اپنے کو دبانے کی کوشش کی مگر اس طرح وہ چھپ کر اور ظاہر ہو جاتے ہیں۔

وفد خلافت کے واپس آنے کے بعد سید حسین امریکہ چلے گیے، اور وہیں اپنی زبان اور قلم سے ہندوستان کی خدمت میں مصروف رہے، آخر میں ہندوستان آئے، اور ہندوستان کے سفیر بنا کر مصر بھیجے گئے، وہیں ۵، فروری ۱۹۴۹ء میں وفات پائی، سید صاحب کو دکھ تھا، کہ ان کی قابلیت سے ہندوستان کو براہ راست فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ (یادرفتگان، صفحہ ۸۳-۳۷۹)

منشی احتشام علی کاکوری کے رئیس تھے، لکھنؤ میں خیالی گنج میں ایک بہت بڑی کوٹھی بنائی تھی، جو اس زمانہ میں ہر قسم کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی، سید صاحبؒ ان کا احترام اس لیے کرتے، کہ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۴۳ء یعنی وفات کے آخری لمحہ تک ندوہ کے ساتھ بڑے اخلاص کے ساتھ اپنی دلچسپی برقرار رکھی، پھر سید صاحب کے دل میں ان کی قدر و منزلت اس لیے بھی تھی، کہ ان کی بڑی اور وسیع کوٹھی عزیزوں کا مسکن، نو واردوں کا ماویٰ، غریبوں کا ملجا، بڑے بڑے قومی خادموں کی فرودگاہ، علما، و فضلا، اور صلحا کا مہبط اور مسلمانوں کے بڑے بڑے قومی جھگڑوں اور فیصلوں کی عدالت گاہ بنی ہوئی تھی، سید صاحبؒ کو ان کی وفات پر یہ دکھ ہوا، کہ یہ حادثہ پچھلے دور خدمت کے جواہر فضائل کو بھی اپنے ساتھ لے گیا، اور پھر ان کو یاد کرکے اس طرح اپنی تحریروں کو آنسوؤں میں اس طرح تبدیل کر دیا ہے۔

"وہ میں قدیم شریفانہ جوہر، وضعداری، دینداری، مروت، سیرچشمی، اقربانوازی، اور مسکین پروری کا یہ آخری نمونہ تھا، ان کی پوری زندگی میں جس میں وسعت کا زمانہ بھی تھا، اور تنگی کا بھی، ان کے ہاتھ یکساں کھلے رہے، اور اس اخفا کے ساتھ کہ بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ کی خبر نہ تھی، وہ مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت تھے، اس تعلق کو اخیر اخیر وقت تک جس طرح نباہا وہ ان کی سعادت مندی کا نشان ہے، پابندی یہ کہ مرتے وقت تک سجدۂ عبودیت ادا کیا ہے، اور صبر و شکر کے کلمے زبان سے نکلتے رہے، (یادرفتگان ص ۲۵۱)

معاصر سیاسی رہنماؤں کا نوحہ

سید صاحبؒ اپنی زندگی میں سیاسیات میں بھی حصہ لیتے رہے، اپنی سیاسی سرگرمیوں میں ان کو ہندوستان کے ہر قسم کے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ کام کرنے اور ملنے جلنے کا موقع ملا، اپنی شرافت اخلاق اور مرنجاں مرنج طبیعت کی بدولت سیاسی مسلک کے رہنماؤں سے برابر کے خوشگوار تعلقات رکھے خواہ وہ کانگرسی یا خلافتی یا جمعیۃ العلمائی یا مسلم لیگی یا اتحاد المسلمین کے کیوں نہ ہوں، ان کی نظر ان رہنماؤں کی حقیقی اور اندرونی خوبیوں پر جاتی، جن کی وہ دل سے قدر کرکے ان کی وفات پر ان کا اعتراف کرتے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خان (المتوفی ۱۹۲۷ء) کی سیاست کے ساتھ ان کے اس لیے مداح رہے، کہ علی گڑھ، دیوبند، جمعیۃ العلما، مسلم لیگ، کانگریس، خلافت کانفرنس، ہندوستانی دواخانہ، جامعہ ملیہ، اور طبیہ کالج دہلی سب ان کے خوان نعمت کے برابر ریزہ چیں رہے، جب ان کی وفات ہوئی، تو اپنے پورے زور بیان کے ساتھ لکھا، کہ

"حکیم صاحب کی وفات کسی خاندان کا ماتم نہیں، دلی کا ماتم نہیں، قوم کا ماتم ہے، فضل و کمال کا ماتم ہے، اخلاق و شرافت کا ماتم ہے، سنجیدگی و متانت کا ماتم ہے، عقل و رزانت کا ماتم ہے، فکر و اصابت کا ماتم ہے، آزادی و حریت کا ماتم ہے، ہندوستان اور مسلمانان ہند کے طالع و بخت کا ماتم ہے"۔

ع مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا (ص ۸۱)

یہ کوئی رسمی ماتم نہیں، یہ وہی لکھ سکتا ہے، جو اپنے دل کی اندرونی آواز کو موثر طریقہ پر قلم بند کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہو، چند سطروں میں درد و غم کو تاثیر میں ڈھال دیا ہے۔

وہ بہار کے مظہر الحق بیرسٹر (المتوفی سنہ ۱۹۳۰ء) کی قومی و سیاسی سرگرمیوں کے معترف تھے، وہ بہت بڑے کانگریسی کی حیثیت سے اب تک یاد کیے جاتے ہیں، سید صاحبؒ ان کی سیاسی دلچسپیوں سے زیادہ ان کی اخلاقی قوت و جرأت کے ثناخواں رہے، وہ جس طرح اپنی یورپین طرز معاشرت کو الوداع کہہ کر خالص مشرقی بن گئے، اس کو سید صاحبؒ نے ان کی بے مثال اخلاقی جرأت کہا ہے، آخر میں وہ سیاست سے علٰحدہ ہو کر روح اور روحانیت کی تحقیق میں لگ گئے، اور جب ان کی وفات ہوئی، تو سید صاحبؒ نے لکھا کہ ان کی روح اب خود وہاں پہنچ گئی ہے، جہاں کے کشف راز کے لیے بیقرار تھی (ایضاً ص ۹۳)

مولانا محمد علی جوہر سید صاحب سے عمر میں چھ سال بڑے تھے، مگر دونوں میں بڑی دوستانہ بے تکلفی رہی، اور اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا، کہ سیاسی رہنماؤں میں سید صاحبؒ کو ان سے جتنی محبت تھی کسی اور سے نہ ہو سکی، اور رہنماؤں سے بھی ان کو عقیدت تھی، وہ ان کی عزت کرتے، ان سے احترام سے پیش آتے، ان کی خوبیوں کی قدر کرتے، اگر وہ سیاست میں ان کے ہم مسلک ہوتے، تو ان سے قریب تر ہوتے، مگر ان کو مولانا محمد علی سے اللہ واسطے کی محبت تھی، اس لئے ۴ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کو ترپن سال کی عمر میں ان کی وفات کی خبر پائی، تو ان کا رواں رواں روتا دکھائی دیا، اور جب ان پر اپنی ماتمی تحریر لکھنے بیٹھے تو ان کے قلم کی شاید بہترین تحریر قرار دی جا سکتی ہے، اس کا ہر لفظ ان کے آنسو کا ایک قطرہ ہے، اس کی ہر سطر ان سوز سینہ کی چنگاری ہے، اس کا ہر پیرا ان کی غم ناکیوں کا آتش دان ہے، جب وہ ماتم لکھنے بیٹھے ہوں گے، تو زبان حال سے کہہ رہے ہوں گے۔

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑونگا

اور سچ تو یہ ہے، کہ اپنی اس تحریر کے سوز پنہاں سے ہر شمع دل کو جلایا ہے، اور اس کے لیے یہ لکھی گئی ہے، اس کی موت کی یادوں کی تاریک راتوں کو چراغاں کر کے چھوڑا ہے، دونوں کے تعلقات کی بڑی لمبی داستان ہے، اس ماتمی تحریر کے ٹکڑوں ہی سے دونوں کی نبرد محبت کی کیفیت کا اندازہ ہوگا، اور پھر ان ہی سے مولانا محمد علی کی سیرت کی پوری تصویر بھی نظروں کے سامنے سنیما کے پردہ کی طرح چلتی پھرتی نظر آئے گی

دو چار سطروں کے بعد اس مرثیہ کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔

افسوس وہ پُر درد آواز جو سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام پر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی، وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا تھا، اور دوروں کو بے تاب کر دیتا تھا، دریغ کہ قیامت تک کے لیے ساکن ہو گیا، (یاد رفتگان ص ۱۳۳)

سید صاحبؒ اتنا ہی لکھ کر رک جاتے تو غمناک کیفیت کی تاثیر پورا کام کر دیتی، مگر ان کا قلم رکا نہیں، ان کے غم ناک جذبات حروف و الفاظ میں ڈھل کر ان کی نوک قلم کے ذریعہ سے کاغذ پر منتقل ہوتے نظر آتے ہیں، جن میں آورد کے بجائے آمد اور تصنع کے بجائے بے ساختہ پن دکھائی دیتا ہے، رقم طراز ہیں

وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں حسرت کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوش نوا بلبل بن کر چہکتے تھے، ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی، اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پُر جوش سینہ ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہا لیجاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا، وہ پُر زور دست بازو جو شب و روز کی خدمت گذاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے، وہ اب ایسے تھکے کہ

پھر نہ اٹھیں گے، اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے نرغہ میں
تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا، کہ پھر کھڑا نہ ہوگا، الوداع محمد علی الوداع
والسلام الی یوم القیام"۔

شاید کچھ ایسے لوگ بھی زندہ ہوں، جنھوں نے مولانا محمد علی کو دیکھا ہو، اور ان کی سیاسی سرگرمیوں
سے واقف رہے ہوں، وہی اس تحریر کی غمناک کیفیت کا اندازہ کر سکیں گے، اس کو لکھے ہوئے
نصف صدی سے زیادہ مدت گذر چکا ہے، مگر آج بھی محمد علی کے قدرداں اس کو پڑھ کر ضرور اشکبار
ہوں گے، مولانا محمد علی کی سیاست میں ان کی اشک آلود آنکھوں نے ساتھ دیا، ان کے آنسوؤں نے
ان کی غمگساری کی، ان کے مترنم لب کے ترانوں نے ان کی ہم نوائی کی، ان کی سیاست کو ان کی
آتشیں زبان سے سہارا ملا، ان کا پرجوش سینہ ان کا ہم رکاب رہا، وہ اپنی سیاسی نبرد آزمائی میں
ایک شکست خوردہ فوج لے کر لڑے، اور یہ صحیح ہے کہ وہ زخموں سے چور ہو کر گرے، مگر ان کی شکست
میں ان کی عظمت ہے، انھوں نے پوری سیاسی زندگی عزاداری، سوگواری، گریہ وزاری، ماتم داری،
اور مرثیہ خوانی میں ضرور گذاری، وہ اپنی سیاست میں فتح و کامرانی سے ہمکنار نہیں ہوئے، مگر وہ
جس روح، عزم اور استقلال سے سینہ سپر ہو کر ملت اسلامی کے لیے لڑے، وہی ان کا کارنامہ ہے جس سے
ان کے ہم مذہبوں کی روح میں تڑپ اور ان کے قلب میں گرمی پیدا ہوتی رہے گی، یہی ان کی سیاسی
زندگی کا کارنامہ ہے، سید صاحبؒ نے ان کے ان کارناموں کو اپنی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اس طرح
قلم بند کیا ہے،

"تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو، تو امت محمدیؐ کا سوگوار
تھا، فرض ہے کہ پوری امت تیرا سوگ کرے، تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا، سزاوار
ہے، کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے، ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لیے

غم زدہ، بلقان کے لیے اشکبار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختہ غم،
اور بیت المقدس کے لیے وقف الم۔ اے ہند کے آوارہ گرد مسافر تیرا حق سرزمین اسلام
کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا، کہ تیرے لیے اولین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور
اور تو اس میں سما جائے۔

یہ تحریر وہی لکھ سکتا ہے، جو ملت اسلامی کی سیاست کا خود بھی اداشناس اور اس کیلئے سوختہ غم اور
اشکبار ہو، سید صاحبؒ جس وقت یہ تحریر لکھ رہے ہوں گے، ان کی آنکھوں سے ان کے آنسوؤں کے قطروں سے
ان کے قلم کے نیچے کا کاغذ تر ہو گیا ہوگا، اگر وہ کاغذ بھی محفوظ کر لیا گیا ہوتا، تو ان کی اور تحریروں کی طرح یہ بھی ایک
یادگار ہو جاتا، محمد علی کی جدائی پر ان کا قلم اس طرح سوختہ غم ہوا جس طرح فراق یار میں کسی مضطرب اور مہجور عاشق
کا ہو، جراحت دل کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی، مشرق کی مٹی سے اس کا
جسم تھا لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجایا، اس کا دماغ مغربی مگر دل مشرقی تھا، مشرق
کی حمایت میں بارہا مغرب سے مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا، اور اس نے اس کا لوہا مانا، وہ مشرق کا
آفتاب تھا، یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبا، تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا، اور
اسی لیے حق تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز بیت المقدس اس کا مدفن ہے، اے مشرق و مغرب کے
مالک تو اپنی رضامندیوں کے پھول سے اس کا دامن بھر دے۔

اس ایک پیراگراف سے مولانا محمد علی کے کردار کی پوری عکاسی ہوتی ہے، یہ وہی لکھ سکتا ہے، جو ان کی
جگر کاویوں اور عملی ہنگامہ آرائیوں کا اداشناس اور عارف رہا ہو، ان کی سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ
سید صاحب کو ان کی غزل گوئی یاد آئی، تو اس میں یہ لکھ کر آب و رنگ پیدا کرتے ہیں۔
محمد علی کے کارناموں میں اس کی غزل گوئی کا گو کوئی بڑا درجہ نہیں لیکن جس طرح اس کی آخری

پیشین گوئی کی صداقت کو دنیا نے دیکھا اور تسلیم کیا، کہ وہ آزاد غلام ہندوستان کو واپس نہیں آیا، اس کے مرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے زندان خانہ میں بیٹھ کر اپنے جن واردات کو نظم کیا تھا، وہ سراسر صداقت تھی، اور پیشین گوئیوں کی عجیب وغریب مثالیں، اس نے کہا۔

اللہ ہی کے رستہ میں جو موت آئے تو اچھا۔۔

اکسیر یہی ایک دعا میرے لیے ہے،

محمد علی مبارک کہ یہ تیری پرتاثیر دعا، اکسیر بنی، اور تیرے حق میں قبول ہوئی۔

اور پھر محمد علی کے ایک مصرع کو سامنے رکھ کر اپنی ماتمی تحریر کو یہ لکھ کر دل گداز بنا دیا ہے، کہ

مولانا محمد علی کا ماتم جس طرح دنیا میں ہوا، مشرق ومغرب میں ہوا، یورپ اور ہندوستان ہوا، مصر وشام میں ہوا، فلسطین اور اس کے بیت المقدس میں ہوا، وہ شاید ہی کسی کے لیے ہوا ہو، صاحب دل شاعر کی اس پیشین گوئی کی صداقت سے کس کو انکار ہے۔

ماتم بہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے۔

اس کے بعد سید صاحب نے مولانا محمد علی سے اپنے پرکیف تعلقات کی یادوں کو سوز سے اپنے دل وجگر کو تشنہ فریاد دکھایا ہے، مولانا محمد علی کی موت پر اس سے بہتر نثری نوحہ نہیں لکھا گیا ہے، اس میں درد و الم کے ساتھ شادی وغم بھی اس لیے ہے کہ لکھنے والے کے شیشۂ دل میں مولانا محمد علی ایک جام جم کے مانند نظر آئے، اس کو اپنے خامۂ معجز رقم سے لوگوں کے سامنے اس طرح آشکارا کر دیا ہے، کہ یہ انشا پردازی کا شاہکار اور درد عشق کا گہر آبدار نظر آتا ہے، جس کو ہمیشہ دیدۂ حیران اور چشم گریاں کے ساتھ پڑھا جائے گا، اس میں خون کے آنسو تحریر کے نافہ ہو میں بند ہو کر مشک اذفر بن گئے ہیں۔ (یادرفتگان۔ صفحہ ۳، ۱۳۳) (باقی)

کیا مغصوبہ زمین پر مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے؟

از

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ

اسلامی قوانین سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے کو بھی یہ حقیقت ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ حکومت اسلامیہ میں غیر مسلم رعایا کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے، یعنی انھیں اپنے دین کے مطابق زندگی گزارنے کا مکمل قانونی حق دیا گیا ہے، چنانچہ اسلامی اصول قانون میں "نترکھم وما یدینون"[۱] (ہمیں اللہ کے رسول کی طرف سے غیر مسلم رعایا کو ان کے مذہب پر پوری طرح عمل کی آزادی دینے کا حکم ہے) ایک ایسی اصل وبنیاد ہے، جس سے قانون شریعت کا معمولی طالب علم بھی بے خبر نہ ہوگا، (اور یہ اصل حضرت عمرؓ کے قول سے ماخوذ ہے[۲]۔ ظاہر ہے کہ اس آزادی میں عبادات اور معاملات دونوں قسم کے احکام شامل ہیں کہ غیر مسلم اپنے مذہب کے مطابق جس طرح چاہیں لین دین کریں، اور جس طریقہ پر چاہیں عبادت کریں، اسلامی قانون اور

۱؎ فقہ حنفی کی مشہور ومعتبر ترین کتاب ہدایہ اخیرین میں ہے: "نحن امرنا بأن نترکھم وما یدینون۔" (ہدایہ۔ ص ۳۶، ج ۴، برہان الدین المرغینانی (متوفی ۵۹۳ھ) (مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی)۔ اس کتاب میں یہ اصول متعدد جگہ بیان ہوا ہے، یہاں صرف ایک موقع کی نشاندہی پر اکتفا کیا گیا ہے، ۲؎ ہدایہ کے مشہور شارحین علامہ بدرالدین عینی نے بنایہ شرح ہدایہ جلد ۳ ص ۲۰۹ میں اور اکمل الدین محمود البابرتی نے عنایہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ انھوں نے اپنے عمال سے فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ جزیہ میں میتہ خنزیر اور شراب وصول کرتے ہو، حضرت بلالؓ نے فرمایا کہ ہاں ایسا ہوتا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو بلکہ ان سے کہو کہ انھیں بیچ دیں اور تم لوگ اس کی قیمت لے لیا کرو (عنایہ للبابرتی ج ۳ ص ۲۳۲ مطبوعہ کلکتہ ۱۲۴۵ھ ۱۸۳۰ء)

مسلمانوں کے مزاج سے جو شخص ذرا بھی باخبر ہے وہ جانتا ہے کہ خنزیر ان کے یہاں کس درجہ ناپاک اور قابل نفرت چیز ہے کہ اس کا نام لینا بھی طبیعت پر گراں ہوتا ہے، اس کی خرید و فروخت بھی ان کے لئے قطعاً ممنوع ہے، مگر اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو، اگر ان کا مذہب اجازت دیتا ہے تو خنزیر کی خرید و فروخت اور اس کے استعمال کی پوری قانونی اجازت ہے، جس کا ذکر فقہ (اسلامی قانون) کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں موجود ہے، اس کی مزید تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

غیر مسلموں کو معاملات ہی کی طرح عبادات میں بھی مکمل آزادی اسلامی حکومت کے تحت حاصل ہوتی ہے، دنیا جانتی ہے کہ اسلام میں بت پرستی کی سخت ممانعت ہے، مگر اس کے باوجود اسلامی حکومت کے تحت رہنے والے غیر مسلموں کو اپنے عبادت خانوں میں اس سے روکا نہ جائے گا۔ مزید یہ کہ انھیں ایسے علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی غالب تعداد نہ ہو، بت خانے بنانے سے بھی نہیں منع کیا جائے گا، جیسا کہ فقہ کی معروف و معتبر کتاب بدائع الصنائع میں ہے۔[1]

لو فعلوا ذالك اظهار شعائر الكفر، في كنائسهم لا يتعرض لهم وكذا الوضرب الناقوس في جوف كنائسهم ... ولا يمنعون من بيع الخمر والخنزير والصليب وضرب الناقوس . . .

اگر غیر مسلم اپنے کفریہ مراسم اپنے عبادت خانوں میں انجام دیتے ہیں تو انھیں اس سے منع نہیں کیا جائیگا، . . . اور انھیں شراب و خنزیر نیز صلیب کی خرید و فروخت سے بھی نہیں روکا جائیگا، اور ایسے مقامات پر کہ جہاں مسلمانوں کی بہت زیادہ آبادی نہ ہو

[1] بدائع الصنائع۔ ص ۱۱۳ - ۱۱۴ - ج، لملك العلماء الكاساني۔ (المتوفى ۵۸۷ھ)، طبع بمطبعة الجمالية مصر الطبعة الاولى (۱۳۲۸ھ - ۱۹۱۰ء)

في القرى أو في موضع ليس من أمصار المسلمين فلا يمنعون من احداث الكنائس والبيع كما لا يمنعون عن اظهار بيع الخمور والخنازير۔

نئے عبادت خانے بنانے سے بھی منع نہیں کیا جائیگا، جس طرح شراب و خنزیر کی کھلی خرید و فروخت سے نہیں روکا جائے گا۔

حکومت اسلامی میں جب نئے بت خانے بنانے تک کی اجازت ہے تو ان کے قدیم اور اسلامی حکومت کے قیام سے پہلے کے بت خانوں، مندروں، گرجا گھروں وغیرہ کا توڑنا کیونکر قانون شرعی کی رو سے درست ہو سکتا ہے، چنانچہ اس کی صراحت بھی معتبر کتب فقہ میں ملتی ہے۔ مثلاً مشہور مصری محقق ابن ہمام (متوفی ۸۶۱ھ) اپنی شہرۂ آفاق معتبر فقہی کتاب فتح القدیر میں یہ حکم شرعی بیان کرتے ہیں:-

ما فتحه المسلمون عنوة... عندنا۔ لا تهدم البيعة والكنيسة... ... لأن الصحابة... فتحوا كثيرا من البلاد عنوة ولم يهدموا كنيسة ولا ديرا ولم ينقل ذالك قط

اسلامی مفتوحہ ملکوں میں غیر مسلموں کے عبادت خانے توڑے نہ جائیں گے ... کیونکہ صحابہؓ نے بہت سے ملکوں کو بزور شمشیر فتح کیا، مگر انھوں نے کہیں بھی غیر مسلموں کا کوئی عبادت خانہ نہیں توڑا ....

....

....

آگے چلکر مزید لکھتے ہیں :-

ولایتعرض للقدیمۃ ..... واعلم ان البیع والکنائس القدیمۃ فی السواد لاتھدم علی الروایات کلھا واما فی الامصار ..... ذکر الامام محمد، انھا لاتھدم، وعمل الناس علی ھذا فانا رأینا کثیرا منھا توالت علیھا ائمۃ وازمان وھی باقیۃ لم یأمر بھدمھا امام فکان متوارثا من عھد الصحابۃ رضی اللہ عنھم ..... فالکنائس الموجودۃ الآن فی دار الاسلام غیر جزیرۃ العرب کلھا ینبغی ان لاتھدم [1]

غیر مسلموں کے پرانے عبادت خانوں کو چھیڑا نہ جائیگا اور دیہاتوں کے قدیم عبادت خانے ہرگز نہیں توڑے جائیں گے، اس میں فقہاء احناف کا کوئی اختلاف نہیں، اور شہروں کے عبادت خانوں کے بارے میں بھی امام محمدؒ کا یہی فتوے ہے کہ نہیں توڑے جائیں گے، یہی وجہ ہے کہ لوگ اسی پر عمل کرتے ہیں، اسی لیے پرانے عبادت خانے ہم یہاں (مصر میں) موجود دیکھتے ہیں، حالانکہ کتنے حکمران بدل چکے ہیں، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ سے یہ چلے آرہے ہیں، اسلیے آج کل دارالاسلام میں جتنے بھی قدیم عبادت خانے ہیں، جزیرۃ العرب کے علاوہ کسی بھی جگہ انھیں توڑا نہ جائے،

مذکورۂ بالا عبارت سے غیر مسلموں کے عبادت خانوں کے بارے میں حکم شرعی معلوم ہونے کے ساتھ متعدد دیگر اہم باتوں کا پتہ بھی چلتا ہے، مثلاً یہ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جو پوری امت کے لیے نمونۂ عمل ہیں، انھوں نے اپنے زمانہ میں بے شمار غیر مسلم علاقے فتح کرکے اسلامی حکومت

[1] فتح القدیر لابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ۔ ج ۴ ص ۳۸۰ (الطبعۃ الاولی بالمطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق مصر ۱۳۱۶ھ)

اندر داخل کئے، مگر کہیں بھی انھوں نے پہلے سے بنے ہوئے بت خانے یا غیر مذاہب کے عبادت خانے نہیں توڑے بعد کے مسلم فاتحین نے بھی یہی رویہ اپنایا، چنانچہ مصنفؒ کے بیان کے مطابق ان کے زمانہ نویں صدی ہجری کے آخر تک مصر جیسے ملک میں جہاں ۹۵ فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ غیر مسلموں کے قدیم عبادت خانے باقی تھے، (بلکہ ابتک ہوں گے)، حالانکہ مصر، اسلام کے دور اول ہی میں، خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (متوفی ۲۳ھ) کی خلافت میں فتح ہوچکا تھا، اور اس کے بعد درجنوں خلفاء اور حکمران ہوئے، مگر کسی نے ان غیر مسلموں کے عبادت خانوں کے توڑنے کا حکم نہیں دیا۔

اس سلسلہ میں علامہ شامیؒ (متوفی ۱۲۵۲ھ) نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ردالمحتار میں یہ عجیب وغریب واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ فتنۂ تاتار کے زمانہ میں شام کے یہودیوں نے تاتاریوں کی حمایت کرکے مسلمانوں کے ساتھ غداری کی تھی، جس کے نتیجہ میں انھیں قانوناً حقوق شہریت سے محروم کردینا چاہیئے تھا، مگر اس کے باوجود ان کے عبادت خانے آج تک باقی ہیں، [1] . . .

اس کی بنیادی وجہ وہی ہے، جس کا اوپر ذکر آیا، یعنی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرز عمل، مزید براں یہ کہ محقق ابن ہمامؒ نے جو خود بڑے درجہ کے فقیہ ہیں، اور جن کی تحقیقات وآراء کو قانون شرعی کی حیثیت دی جاتی ہے، انھوں نے یہ رائے بھی دی ہے کہ..... غیر مسلموں کے عبادت خانے (خواہ وہ کہیں بھی ہوں) توڑے نہ جائیں، اور یہ رائے آج نہیں بلکہ تقریباً سات سو سال پہلے دی گئی ہے، جب کہ چار دانگ عالم میں مسلمانوں کا طوطی بول رہا تھا، اور ساری دنیا گویا ان کی عظمت وبالادستی کے سامنے سرنگوں تھی، اور پھر ہندوستان جیسے غیر مسلم اکثریت کے ملک میں یہ بات نہیں کہی گئی، بلکہ مصر جیسے ملک میں جہاں، جیسا کہ اوپر گذرا، غیر مسلموں کی تعداد برائے نام ہے، ان دلائل وشواہد کی موجودگی میں بھلا یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان

[1] ردالمحتار ج ۳ ص ۲۷۲ لابن عابدین شامی (مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ دیوبند)

جیسے ملک میں، جہاں ہمیشہ غیر مسلم اکثریت میں رہے، مسلم حکمرانوں نے جبراً غیر مسلموں کے عبادت خانے یا مندر توڑ ڈالے ہوں گے، اور یہ بات اور بھی زیادہ بعید از قیاس اور خلاف شرع ہے کہ ان مندروں کی جگہ پر مسجدیں بنائی ہوں گی، کیونکہ مسجد بہر حال خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے لئے بنائی جاتی ہے اور وہ شرعاً کسی ایسی جگہ پر نہیں بن سکتی جو کسی سے زبردستی بغیر خوشدلی اور رضامندی سے لی گئی ہو، اگر بنالی گئی تو بنانے والے بجائے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سخت گناہگار اور اللہ تعالے کے غصہ کے مستحق ہوں گے۔ فقہ اور قانون شریعت کی تمام معتبر کتابیں اس شرعی حکم کے بیان سے بھری پڑی ہیں، بلکہ ان کتابوں میں بعض علماء کی یہ رائے بھی ملتی ہے کہ ایسی جگہ پر اگر نماز پڑھی جائے گی تو نماز ہی نہ ہوگی،[1] اور اس بات پر تو تمام فقہاء اور قانون شریعت کے ماہرین متفق نظر آتے ہیں کہ نماز پڑھنے والا گناہگار ہوگا، اور نماز کے اجر و ثواب سے محروم رہے گا۔ مثلاً فقہ و قانون شریعت کی ایک معتبر و مستند کتاب درمختار میں ہے۔

تکرہ الصلاۃ فی ... ارض مغصوبۃ أو للغیر[2]	مغصوبہ یا غیر کی زمین میں نماز ناجائز ہے۔

اس عبارت کی شرح کے دوران علامہ ابن عابدینؒ جو خود بہت بڑے فقیہ اور ماہر قانون شریعت ہیں، اور جن کی رائے پر فتوی دیا جاتا اور فیصلہ کیا جاتا ہے، ایک عجیب بات فرماتے ہیں کہ اگر کسی مجبوری کی، مثلاً جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ایک آدھ وقت کی نماز اگر مالک زمین کی

[1] یہ حکم امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک ہے، جو ایک خاص اصل پر مبنی ہے، جس کی تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، مختصر طور پر ابن رشد اندلسی (متوفی ۵۹۵ھ) کی کتاب ہدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۱۲۔ میں بھی یہ مسئلہ بیان ہوا ہے، (مطبوعہ مطبعۃ الاستقامۃ۔ قاہرہ) [2] درمختار مع الرد ج ۱ ص ۲۵۵ للفقیہ علاء الدین الحصکفی۔ (متوفی ۱۰۸۸ھ)

بلا اجازت پڑھنا ضروری ہو جائے تو غیر مسلم کی زمین پر بلا اجازت ہرگز نہ پڑھے، بلکہ کسی مسلمان کی زمین پر بلا اجازت پڑھ لے، کیونکہ عادۃً کسی مسلمان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ ایک وقت کی نماز پڑھنے کی اجازت نہ دے گا۔ برخلاف غیر مسلم کے غالباً اسی لیے حکم میں فرق ہوگیا ہے، موصوف کے الفاظ یہ ہیں:-

فان اضطر بین ارض مسلم او کافر یصلی فی أرض مسلم[1]	اگر کسی مسلمان یا کافر کی زمین میں نماز پڑھنے کے لئے مجبور ہو جائے تو مسلمان کی زمین میں نماز پڑھے گا۔

اسی کتاب میں یہ مسئلہ بھی ملتا ہے۔

یؤخذ من التعلیل ... کراھۃ الصلاۃ فی معابد الکفار ویکرہ للمسلم الدخول فی البیعۃ والکنیسۃ[2] .... والظاهر انها تحريمية[3]۔	مصنف کی دلیل سے کفار کے عبادت خانوں میں نماز پڑھنا اور اس کے اندر مسلمانوں کا داخل ہونا مکروہ تحریمی (ناجائز) ثابت ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں تیرھویں صدی کے مشہور یمنی عالم و محقق علامہ قاضی محمد بن علی الشوکانی (متوفی ۱۲۵۵ھ) نے اپنی مشہور ترین کتاب نیل الاوطار میں ممتاز ترین علمائے امت سے مغصوبہ زمین پر نماز پڑھنے کا یہ حکم نقل کیا ہے۔

[1] درالمختار۔ ج ۲ ص ۲۵۵ (مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ، دیوبند) [2] غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں چاہے تصاویر نہ ہوں، نماز پڑھنے کی کراہت مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مذہب ہے، جو انھوں نے حضرت عمرؓ کی ہدایت سے اخذ کیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۱۴ لابن رشد) [3] ایضاً ج ۱ ص ۲۵۴

"قال القاضی ابوبکر بن العربی	تیرہ[13] جگہوں پر نماز نہ پڑھی جائے
لا یصلی فیہا ثلاثۃ عشر مکانً	.... ان میں سے ایک جگہ
...... وزاد العراقی فی الارض	دوسرے کی زمین بھی ہے۔
المغصوبۃ"۔	

اور اس ممانعت کی وجہ قاضی شوکانی یہ بیان کرتے ہیں:۔

واما الصلاۃ فی الأرض	کیونکہ مغصوبہ زمین پر نماز پڑھنے سے
المغصوبۃ فلما فیہ من	دوسرے کی چیز کا مالک کی اجازت کے
استعمال لغیر بغیر اذنہ[1]	بغیر استعمال لازم آتا ہے (یہ شرعاً ممنوع ہے)

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی شاید بے محل نہ ہو گا کہ یہ حکم یعنی مغصوبہ زمین میں نماز پڑھنے کی ممانعت دراصل اس صورت کا بیان ہوا ہے، جب بغیر اجازت کسی کی زمین پر ایک آدھ نماز پڑھ لی جائے، اور اگر کسی کی زمین پر مستقل مسجد بلا اجازت بنا کر نمازیں پڑھی جائیں تو ممانعت کتنی شدید ہو گی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں،

بغیر اجازت کسی کی چیز پر قبضہ کر لینا شرعی اصطلاح میں غصب کہلاتا ہے، اس کی مذمت اور بالخصوص کسی کی زمین غصب کرنے پر، آخرت میں بھیانک سزا کا ذکر جس انداز سے احادیث میں آیا ہے، اس کے پیش نظر آخرت پر یقین رکھنے والے کسی بھی شخص کو غصب کی جرأت نہیں ہو گی، چہ جائے کہ وہ اس پر مسجد بنا کر خداوند تعالیٰ کا مزید غضب مول لے، متن حدیث یہ ہے:

من أخذ شبرا من الأرض	جو شخص ایک بالشت زمین بھی کسی
ظلما فانہ یطوقہ یوم القیامۃ	دوسرے کی ناحق لے گا قیامت کے دن

---

[1] نیل الاوطار للشوکانی ج ۲ ص ۱۴۳-۱۴۴ (مطبوعہ دار الجیل، بیروت)

من سبع ارضین[1]	اسے نہایت سخت عذاب ہو گا جس کا
	تصور بھی دنیا میں مشکل ہے۔

مشہور شارح حدیث محی الدین نووی (متوفی ۶۷۶ھ) نے اس باب کی احادیث کی تشریح کرتے ہوئے، جن میں حدیث بالا بھی ہے، ان سے ماخوذ مسائل کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے:۔

وفی ہذہ الاحادیث تحریم	ان احادیث سے ظلم اور غصب
الظلم وتحریم الغصب فیہ	کے حرام ہونے کا حکم ثابت ہوتا ہے
امکان غصب الأرض	اور اس پر سخت سزا ملنے کا پتہ
وتغلیظ عقوبتہ[2]	بھی چلتا ہے۔

ان احکام و ہدایات کی وجہ سے علمائے اسلام اور ماہرین قانون شریعت نے اپنے فتاویٰ میں یہاں تک احتیاط برتنے کا فتویٰ دیا ہے کہ اگر کسی جگہ پر بظاہر زمین کے مالک یا مالکین کی اجازت سے مسجد بنی ہو، لیکن بعد میں چاہے جتنی مدت بعد، یہ پتہ چلے کہ اس زمین کے کسی جزو کا ایک ایسا شخص بھی مالک ہے جس سے اجازت نہیں لی گئی ہے تو وہ عمارت شرعاً مسجد نہیں رہے گی، بلکہ اس کا وہ حصہ اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہو گا، برصغیر میں فقہ و فتاویٰ کے سب سے بڑے مرکز دار العلوم دیوبند کے مطبوعہ مجموعہ فتاویٰ میں وہاں کے سابق مفتی مولانا محمد شفیع صاحب کے جو بعد میں پاکستان کے مفتی اعظم کی حیثیت سے معروف ہوئے، ان کے فتویٰ کا یہاں اقتباس مع سوال کے دیا جا رہا ہے، جس سے اس بارے میں کافی روشنی ملتی ہے، سائل نے سوال کیا:۔

"...... نے اپنی خرید کردہ زمین مسجد کے لیے وقف کر دی اور اس میں مسجد تیار کر کے چودہ پندرہ سال تک نمازیں پڑھیں، اب ایک شخص کا حق اس مسجد کی زمین میں تخمیناً ڈیڑھ دو ہاتھ (تقریباً ڈھائی فٹ

---

[1] الصحیح للامام مسلم ص ۳۲ ج ۲ - بن الحجاج متوفی ۲۶۱ھ مع الشرح (مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی)

[2] ایضاً ص ۳۲۵

بلکہ اس سے بھی کم، نکلا اور وہ دعوے دار ہے، لہٰذا واقف کا وقف باطل ہوا یا نہیں"؟

اس سوال کا جواب مفتی شفیعؒ صاحب نے حسب ذیل دیا:۔

"اس مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ . . . . . نے جس زمین کو مسجد کے لیے وقف کیا اور مسجد بنایا تھا، اگر فی الواقع اس میں کسی شخص کا حق مشترک نکل آیا تو یہ مسجد نہ رہی بلکہ . . . . . (واقف) کی ملک کی طرف لوٹ گئی، اور اس کے (مرنے کے بعد اس کے) ورثہ کا حق ہو گیا اور جس قدر زمین اس شخص (مدعی) کے حصہ میں آئی وہ اس کی ہے۔"

اس کے بعد مفتی صاحب موصوف نے اپنے اس فتویٰ کی تائید میں فتاویٰ عالمگیری[1] کی ایک عبارت نقل کی ہے جس میں صورت مسئولہ کا بعینہٖ یہی حکم شرعی بتایا گیا ہے، جو مفتی صاحب نے لکھا ہے۔

واضح رہے کہ فتاویٰ عالمگیری وہی ہے، جسے اورنگ زیبؒ عالمگیر نے زر کثیر صرف کر کے اپنے وقت کے ممتاز ترین علماء و فقہاء سے اپنی نگرانی میں، مجموعہ قوانین شریعت مرتب کرایا تھا، تاکہ وہ ہندوستان کا مذہبی آئین اور دستور بنے، چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا بھی، ظاہر ہے کہ اگر اس زمانہ میں یا اس کے بعد اورنگ زیبؒ یا کسی اور ذمہ دار کو یہ معلوم ہوتا کہ فلاں مسجد کی تعمیر ایسی جگہ ہوئی ہے جس کی اس کے مالک سے اجازت نہیں لی گئی تھی، اور بیع یا دوسرے کسی شرعی طریقہ سے بھی حاصل نہیں کی گئی تھی تو یقیناً اس جگہ اول تو مسجد تعمیر ہی نہ کرنے دی جاتی، اور اگر تعمیر ہو جانے کے بعد پتہ چلتا تو چونکہ اسے شرعاً مسجد کی حیثیت حاصل ہی نہیں ہوئی، اس لیے وہ مسجد برقرار نہیں رکھی

---

[1] فتاویٰ دار العلوم ص ۵۲۳ جلد پنجم و ششم (مطبوعہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند) میں عالمگیری بحوالہ بالا عبارت یہ ہے:۔ . . . . فقد جعل المسجد جزأً شائعاً فیبطل کما لو جعل ارضه مسجداً ثم استحق شقص شائعاً یعود الباقی الی ملکه۔ (عالمگیری۔ مصری مطبوعہ، ج ۲ ص ۳۵۶) منقول از فتاویٰ دار العلوم
لیکن ہمارے سامنے عالمگیری کا جو نسخہ ہے (الطبعة الثانیة بالمطبعة الکبری الامیریة بولاق) اس میں یہ عبارت ص ۴۵۶ ج ۲ پر ہے۔

جا سکتی تھی، بلکہ مالک کو زمین لوٹا دی جاتی، لیکن ان میں سے کچھ نہیں ہوا، یا کم سے کم اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ عالمگیر یا اس سے پہلے کے کسی بادشاہ یا کسی عام فرد یا رئیس نے کسی ایسی جگہ پر کوئی مسجد نہیں بنوائی، جو دوسرے کی ملکیت میں ہو، اور مالک سے بخوشی نہ لی گئی ہو، خواہ بالعوض یا بلا عوض، اگر بالفرض حکام و رؤسا ایسی کسی غلط حرکت کا ارتکاب کر بیٹھتے تو وہ علماء کبھی خاموش نہ رہتے، جنھوں نے اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر اور قید و سلاسل کا خطرہ مول لیکر بھی کلمۂ حق سربراہانِ حکومت کے سامنے برملا کہا، مثلاً حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، جنھوں نے اکبر کی بیدینی، اور جہانگیر کی بے راہ روی، سجدۂ تعظیمی پر کھلم کھلا تنقید کی اور اس کی پاداش میں انھیں سال بھر گوالیار کے قلعہ میں مقید رہنا پڑا[1] تو ان سے نیز ان جیسے دیگر ربانی علماء سے یہ بعید ہے کہ وہ مغصوبہ زمینوں پر مسجدیں تعمیر ہوتے دیکھتے رہے ہوں اور کچھ نہ کہا ہو۔ اور یہ بات اس سے بھی زیادہ بعید از قیاس ہے کہ علماء نے کسی مسجد کے مسجد نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہو اور یہ بتا دیا ہو کہ مغصوبہ زمین پر بنی مسجد میں نماز پڑھنا گناہگار بنانا ہے، پھر بھی عوام نے ان کی بات نہ مانی ہو؟ جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلم عوام پر بالخصوص غیر منقسم ہندوستان میں ہمیشہ علماء کی گرفت رہی ہے، خصوصاً مذہبی معاملات میں عوام نے ہمیشہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے مقابلہ میں بھی علماء کی بات مانی ہے، اس صورت حال کے باوجود ان مسجدوں کا مسجد کی حیثیت سے باقی رہنا، جن کے بارے میں آج انگریزوں کی پھیلائی ہوئی منصوبہ بند غلط خبروں کی بنا پر یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ مندر کی جگہ بنائی گئی ہیں، یہ ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے کہ فلاں فلاں مسجدیں مندروں کی جگہ یا مغصوبہ زمین پر بنائی گئی ہیں، اس بے بنیاد دعوے

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد ۴ ص ۱۶۷ تا ۱۶۹ از مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ۔ مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔ (پہلا ایڈیشن)

خلاف تو بہت سے دلائل و قرائن ہیں، مگر اس کے حق میں ایک بھی مضبوط دلیل یا قرینہ نہیں،
یہاں اس کی وضاحت ضروری تو نہیں معلوم ہوتی کہ کسی چیز یا جگہ پر کسی کا حق اسی وقت
ثابت ہوتا یا ہو سکتا ہے، جب مدعی کے پاس مضبوط دلیل ہو، اس کے بغیر محض دعوے
سے نہ کوئی حق ثابت ہوتا ہے، اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی ثابت شدہ حقیقت بدلتی ہے،
اور یہ ایسا تسلیم شدہ اصول ہے، جسے سب ہی مانتے اور برتتے ہیں، آج کل کی عدالتیں
بھی اور شریعت اسلامی کے ماہرین بھی۔

یہاں یہ بتانا بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ مسجد بنانے اور وقف کرنے وغیرہ کے
معاملات میں قانون شریعت کا تقاضا بہت زیادہ احتیاط برتنے کا ہے، جس کا کچھ اندازہ
ذیل کے فتوے سے ہوگا، جو ماضی قریب کے سب سے ممتاز صاحب ارشاد و افتاء عالم
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، یہ فتویٰ موصوف کے
مطبوعہ مجموعہ فتاویٰ میں شامل ہے، تفصیل ملاحظہ ہو:-

سوال:- اس ملک میں مالک زمین ہندو ہے، اور قابض مسلمان ہے، مگر مسلمان
ایسا قابض ہے کہ ہندو اسے بے دخل نہیں کر سکتا، قانون انگریزی کے ذریعہ سے مسلمان
کو اختیار تام ہے، وہ اس زمین میں مکان، قبرستان، مسجد سب بنا سکتا ہے، ....

.... اب (سوال یہ ہے کہ) مسلمان اس مذکورہ زمین کو قبرستان وغیرہ کے
واسطے وقف کر سکتا ہے، یا نہیں، شریعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی"؟

اس کا جواب حکیم الامت نے یہ دیا:-

"صحت وقف کی شرائط میں سے واقف کا مالک ہونا بھی ہے، اور یہاں معدوم
ہے، لہٰذا یہ وقف جائز نہیں، اور بلکہ کوئی تصرف و استعمال بھی بدون مالک کی خوشی کے

درست نہیں۔" الخ[1]

مقام غور ہے کہ قانون ملکی کی رو سے ایک شخص کو پوری اجازت ہے، کہ وہ
کسی زمین میں مکان، مسجد اور ہر چیز بنا سکتا ہے، لیکن قانون شریعت میں اس کی
اجازت نہیں تو کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ملکی قانون کا سہارا لے کر
مسجد بنائے، اگر ایسا کرے گا تو وہ گناہگار ہوگا، اور وہ عمارت شرعاً مسجد نہ ہوگی۔

ان حقائق کی روشنی میں پھر یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، کہ کسی مسلمان بادشاہ
یا کسی امیر و حکمراں نے کسی ایسی زمین پر مسجد بنائی ہوگی، جو شرعاً اس کی ملکیت میں
نہ ہو! ؟ اس بنا پر بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا، آج جو یہ کہا
جا رہا ہے، کہ فلاں مسجد، مندر کی جگہ بنی ہے، محض غلط پروپگنڈا بلکہ الزام تراشی ہے،
جس پر کوئی سنجیدہ، اور منصف شخص یقین نہیں کر سکتا۔

---

[1] امداد الفتاویٰ۔ ج ۲ ص ۶۱۳ - ۶۱۴ از حضرت تھانویؒ۔ (شائع کردہ مکتبہ
اشرف العلوم۔ کراچی ۱۳۷۰ھ)

سیرت عائشہؓ
اور
مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

(از محمد عارف اعظمی، عمری دار المصنفین)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم برصغیر کے ممتاز اور معروف عالم تھے، رسالہ (برہان) اور مولانا دراصل ایک ہی اسم کے دو مسمّٰی خیال کئے جاتے ہیں، ان کو مولانا سید سلیمان ندویؒ سے خاص عقیدت تھی، اور وہ ان کے علم و فضل کے بڑے مداح و معترف بھی تھے، سید صاحبؒ کے انتقال کے بعد معارف کا "سلیمان نمبر" شائع ہوا تو اس میں مولانا سعید احمد صاحب کا بھی ایک مبسوط مقالہ شامل تھا، جس سے سید صاحبؒ سے ان کے غیر معمولی تعلق اور عقیدت و محبت کا پتہ چلتا ہے، ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے سید صاحبؒ پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بھی شرکت کی تھی، اور "سید سلیمان ندویؒ اور فن سوانح نگاری" کے عنوان سے ایک مقالہ بھی پڑھا تھا، جس میں سید صاحبؒ کی گراں قدر سوانحی تصنیفات کا تعارف کرایا ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے سید صاحبؒ کی مشہور تصنیف "سیرت عائشہؓ" پر بھی بحث و گفتگو کی ہے، اور اس کو "علامہ کی معرکۃ الآرا تصنیف" (مجموعۂ مقالات سیمینار ص ۹۵) قرار دیا ہے، ان کے نزدیک اس میں "بعض بڑی اہم بحثیں آگئی ہیں، جو حضرت عائشہؓ کی غیر معمولی شخصیت کی حیات کے بعض نازک اور اہم ادوار سے تعلق رکھتی ہیں" (ص ۹۵) انھوں نے اس کتاب کے بارہ میں علامہ اقبال کی اس رائے کی تائید بھی کی ہے، کہ "سیرت عائشہؓ ہدیہ سلیمانی نہیں، بلکہ سرمۂ سلیمانی ہے، جو اہل بصیرت و بصارت کی نگاہوں کو مدتوں روشنی دیتا رہیگا" (ص ۹۶)

اس غیر معمولی تحسین کے ساتھ ہی انھوں نے سیرت عائشہؓ کی بعض باتوں کی طرف توجہ بھی دلائی ہے، مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایک بہت ممتاز اور وسیع النظر عالم تھے، ان کے خیالات پر بحث و گفتگو کرنا اسی درجہ کے بلند پایہ عالم اور ممتاز اہل قلم کا کام تھا، لیکن دار المصنفین سے وابستہ ہونے کی وجہ سے یہ حقیر راقم اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے۔

خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد امت مسلمہ زبردست بحران کا شکار ہو گئی تھی، حضرت علیؓ انتشار سے بچنے کے لیے قاتلین عثمانؓ کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے، جبکہ بنو امیہ اس کے لئے شد سے مصر تھے کہ سب سے پہلے ان ہی سے نپٹا جائے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے، کہ حضرت عائشہؓ بھی بنو امیہ کی ہمنوا تھیں اور وہ قاتلین عثمانؓ سے قصاص لینے ہی کے لیے آگے بڑھی تھیں، لیکن سید صاحبؒ کو اس عام خیال سے اتفاق نہیں ہے، بلکہ وہ حضرت عائشہؓ کے جرأت مندانہ اقدام کا مقصد "اصلاح بین الناس" بتلاتے ہیں، یہ توجیہ بالکل درست اور واقعہ کے عین مطابق ہے، کیونکہ اگر حضرت عائشہؓ کا مقصد بھی بنو امیہ کی طرح صرف حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص لینا ہوتا تو وہ بصرہ نہ جاتیں بلکہ شام کا رخ کرتیں جو بنو امیہ کا مرکز تھا، اور وہاں ان کے ہمنواؤں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کسی بھی موقع پر بنو امیہ کا ساتھ نہیں دیا، اس موقع پر بھی مکہ معظمہ سے چھ ہزار آدمیوں کی فوج، کئی لاکھ درہم اور سواری کے لیے بڑی تعداد میں اونٹ فراہم کرنے کے بعد انھوں نے روانگی کی سمت متعین کرنے کے لئے اپنی قیام گاہ پر اپنے اصحاب سے جو مشورہ کیا اور اس میں خود جو رائے دی اس سے ان کے اصل مقصد کی وضاحت ہوتی ہے، ان کی رائے یہ تھی کہ:-

"چونکہ سبائی اور عام باغی مدینہ ہی میں ہیں اس لیے ادھر ہی کا رخ کیا جائے"۔ (سیرت عائشہؓ ص ۱۱۵)

مگر مشورہ کے بعد بصرہ کی جانب پیش قدمی مناسب سمجھی گئی، اس لیے وہ وہاں تشریف

ے گئیں، اور جنگ جمل کا واقعہ پیش آیا، اس موقع پر حضرت عائشہ رض کی رائے پر اگر عمل ہوا ہوتا، یعنی اگر وہ بصرہ کے بجائے مدینہ منورہ کا رخ کرتیں تو واقعہ کی نوعیت اس سے مختلف ہوتی جیسا کہ سید صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"غالباً اگر ایسا ہوتا تو عجب نہیں کہ واقعہ کی صورت دوسری ہوتی، (سیرت عائشہ رض ص ۱۱۵)

بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ مکہ معظمہ سے صحیح سمت متعین نہ ہونے کی وجہ سے یہ نوبت پیش آئی، اور حضرت عائشہ رض کو اپنے اقدام پر افسوس ہوا، ظاہر ہے یہ افسوس "دعوت اصلاح" پر نہ تھا، بلکہ اس کے لئے اختیار کئے گئے طریقہ پر تھا، جس کو وہ اپنی اجتہادی غلطی سمجھتی تھیں اور اس پر عمر بھر افسوس کرتی رہیں،

سید صاحب کی اس تحقیق پر کہ :-

"حضرت عائشہ رض کو اپنی اس اجتہادی غلطی پر کہ اصلاح کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا تھا وہ کہاں تک مناسب تھا، ان کو عمر بھر افسوس رہا" (سیرت عائشہ رض ص ۱۴۴)

تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم لکھتے ہیں :-

"حضرت ندوی حضرت عائشہ رض کے اس عمل کو اجتہادی غلطی تسلیم کرتے ہیں اور ان کے افسوس و تاسف کا حوالہ بھی دیتے ہیں، لیکن اس اجتہادی غلطی اور اس پر تاسف کی تائیدی شہادت ماخذ کی روایات سے نہیں پیش کرتے اور جو روایات پیش بھی کی گئی ہیں، ان سے جنگ میں خونریزی، اصحاب وفا کی شہادت اور قرآن کریم کی آیات کی تلاوت پر رونے کا اظہار ہوتا ہے" (سید سلیمان ندوی اور فن سوانح نگاری، مجموعہ مقالات سید سلیمان ندوی سمینار ص ۹۵)

مولانا اکبرآبادی کا خیال ہے کہ سید صاحب نے حضرت عائشہ رض کی اس اجتہادی غلطی اور اس پر تاسف کی کوئی تائیدی شہادت روایات سے نہیں پیش کی ہے، حالانکہ سید صاحب نے بخاری شریف کی

اس روایت کا حوالہ دیا ہے، جس میں مذکور ہے کہ "وفات کے وقت انھوں نے وصیت کی کہ مجھے روضۂ نبوی میں آپ صلعم کے ساتھ دفن نہ کرنا، بقیع میں اور ازواج کے ساتھ دفن کرنا" (سیرت عائشہ رض ص ۱۳۲ بحوالہ بخاری، کتاب الجنائز) اس کی وجہ سید صاحب کے بیان کے مطابق حاکم نے مستدرک میں خود حضرت عائشہ رض کی زبانی یہ بیان کی ہے کہ "میں نے آپ صلعم کے بعد ایک جرم کیا ہے" (سیرت عائشہ ص ۱۳۲ بحوالہ مستدرک حاکم جلد ۴ ص ۶)

آخر وہ کونسا جرم تھا جس کی وجہ سے حضرت عائشہ رض اس قدر پشیماں تھیں کہ انھوں نے یہ وصیت کی کہ وہ حضور صلعم کے پہلوئے مبارک میں دفن نہ کی جائیں، جب کہ یہی ان کی عزیز ترین خواہش ہونی چاہئے تھی، غور و تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلعم کے انتقال کے بعد حضرت عائشہ رض کی زندگی کا یہی سب سے سنگین حادثہ تھا یعنی جنگ جمل میں ان کی شرکت جس میں مسلمان باہم دست و گریباں ہوئے، اس لئے وہ اسی کو اپنا ایسا جرم تصور کرتی رہی ہونگی جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلوئے مبارک کے بجائے مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کئے جانے کی وصیت فرمائی تھی، اس کے علاوہ سید صاحب نے جو روایات پیش کی ہیں، ان کے بارہ میں مولانا اکبرآبادی مرحوم ارشاد فرماتے ہیں :-

"اور جو روایات پیش بھی کی گئی ہیں، ان سے جنگ میں خونریزی، اصحاب وفا کی شہادت اور قرآن کریم کی آیات کی تلاوت پر رونے کا اظہار ہوتا ہے" (ص ۹۵)

یہاں سید صاحب کی پیش کردہ روایات کا جائزہ لینا مناسب ہوگا تاکہ حقیقت حال پوری طرح واضح ہو جائے۔

۱۔ حضرت سید صاحب نے پہلی روایت یہ نقل کی ہے کہ

"تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ ایک بصری حضرت عائشہ رض کی ملاقات کو آیا،

آپ نے پوچھا کہ تم ہماری لڑائی میں شریک تھے، اس نے کہا، ہاں، پوچھا کہ تم اس کو جانتے ہو جو رجز یہ شعر پڑھتا تھا، یا اُمّنا خیر اُمّ نعلم۔ اس نے کہا وہ میرا بھائی تھا، راوی کہتا ہے، وہ اس کے بعد اس قدر روئیں کہ میں سمجھا کہ پھر کبھی چپ نہ ہوں گی، (سیرت عائشہؓ صفحہ ۱۳۴)

یہ روایت طبری کی ہے، جس کو سید صاحبؒ نے اپنے اس قول کی تائید میں نقل کی ہے، کہ حضرت عائشہؓ کو عمر بھر اس بات پر افسوس رہا کہ انھوں نے اصلاح کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ درست نہ تھا، لیکن مولانا اکبرآبادی مرحوم اس کو "صرف خونریزی اور اصحابِ وفا کی شہادت پر رونے" پر محمول کرتے ہیں، یعنی ان کا خیال یہ ہے کہ جنگ جمل کے شرکا کی شہادت پر حضرت عائشہؓ روتی تھیں، نہ کہ اپنی اجتہادی غلطی پر، لیکن شہادت پر رونے کا تو کوئی محل نہیں ہے، بلکہ یہ تو فخر و خوشی کا مقام تھا، کہ کچھ لوگوں نے حق کی حمایت میں اپنی جان دیدی، البتہ اس احساس کے تحت ان کا رونا اور افسوس کرنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طریقۂ اصلاح درست نہ تھا جس کی وجہ سے یہ المیہ پیش آیا۔

۲۔ حضرت سید صاحبؒ نے اپنے موقف کی تائید میں دوسری روایت یہ پیش کی ہے۔

"ابن سعد میں ہے کہ جب وہ آیت پڑھتی تھیں۔ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (اے پیغمبر کی بیویو، اپنے گھروں میں ٹھہری رہو) تو اس قدر روتی تھیں کہ روتے روتے آنچل تر ہو جاتا تھا۔

(سیرت عائشہؓ صفحہ ۱۳۴۔ ۱۳۵)

مولانا اکبرآبادیؒ اس روایت کو صرف "قرآن کریم کی آیات کی تلاوت پر رونے" پر محمول فرماتے ہیں، جب کہ یہ آیت عذاب و عقاب کے ذکر میں وارد نہیں ہے، بلکہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں، اس آیت کو پڑھ کر حضرت عائشہؓ کا اس قدر رونا اور تاسف کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان سے اس حکم کی خلاف ورزی ہو گئی تھی کہ وہ اپنے گھر سے نکلیں، بصرہ کا رخ کیا، لوگوں کو اصلاح کی دعوت دی اور پھر جنگ ہوئی یہی وہ

موقع تھا، جب کہ ان سے اس حکم کی خلاف ورزی ہو گئی تھی۔

مولانا نے یہ بھی فرمایا ہے، کہ "(سید صاحبؒ) اس اجتہادی غلطی اور اس پر تأسف کی تائیدی شہادت ماخذ کی روایات سے نہیں پیش کرتے۔" (ص ۹۵)

بخاری شریف کی یہ روایت ہے۔

عن هشام عن ابيه عن عائشة	ہشام بو اسطہ اپنے والد حضرت عائشہؓ
انها اوصت عبد الله بن	سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے عبداللہ
الزبير لا تدفني معهم و	ابن زبیرؓ کو یہ وصیت کی کہ مجھے ان لوگوں
ادفني مع صواحبي بالبقيع	(حضورؐ و ابوبکرؓ و عمرؓ) کے ساتھ دفن نہ
لا ازكى به ابدا۔	کرنا، میری سوکنوں کے ساتھ دفن کرنا،
(بخاری۔ کتاب الجنائز)	میں اس کے سبب سے پاک نہیں کی جاؤں گی۔

اس روایت کو سامنے رکھ کر سید صاحبؒ نے اس کا یہ ٹکڑا نقل کیا ہے،

"بخاری میں ہے کہ وفات کے وقت انھوں نے وصیت کی کہ مجھے روضۂ نبویؐ میں آپؐ کے ساتھ دفن نہ کرنا، بقیع میں اور ازواج کے ساتھ دفن کرنا۔" (سیرت عائشہؓ۔ ص ۱۴۳ بحوالہ بخاری کتاب الجنائز)

اس کے علاوہ سید صاحبؒ نے مستدرک کے حوالہ سے اس کا ایک ٹکڑا یہ نقل کیا ہے، کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "میں نے آپؐ کے بعد ایک جرم کیا ہے۔" (سیرت عائشہؓ ص ۱۴۳ بحوالہ مستدرک حاکم)

مستدرک میں پوری روایت یوں ہے۔

عن قيس بن ابي الحازم	قیس بن ابی حازم سے مروی ہے، کہ
قال قالت عائشة وكانت تحدث	حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرا جی
نفسها ان تدفن في بيتها	چاہتا تھا کہ میں رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ

مع رسول الله صلى الله عليه وسلم
وابي بكر فقالت اني احدثت
بعد رسول الله ﷺ احداثا ادفنوني مع ازواجه
فدفنت بالبقيع (مستدرک حاکم ج ۴ ص ۶)

کے ساتھ اپنے ہی گھر میں دفن کی جاؤں،
مگر انھوں نے (وفات کے وقت) یہ
وصیت کی کہ مجھ سے حضورؐ کے بعد ایک جرم سرزد
ہوگیا ہے، اسلئے مجھکو حضورؐ کی دیگر ازواج کے ساتھ دفن
کرنا، چنانچہ وہ بقیع میں دفن کی گئیں

حاکم نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ حدیث امام بخاری و امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے، لیکن ان دونوں حضرات نے اسکو صحیحین میں درج نہیں فرمایا ہے۔

سید صاحبؒ نے ان کے علاوہ طبقات ابن سعد سے بھی بعض روایتیں نقل کی ہیں، ان میں سے ایک کا ذکر پہلے آچکا ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ "اے کاش میں درخت ہوتی، اے کاش میں پتھر ہوتی، اے کاش میں روڑا ہوتی، اے کاش میں نیست و نابود ہوتی"! (سیرت عائشہؓ صفحہ ۱۳۴ بحوالہ طبقات ابن سعد جزء نساء)

ان روایتوں سے ظاہر ہے کہ سید صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ مستند حوالوں سے لکھا ہے، مولانا اکبرآبادی مرحوم کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ:

"مزید براں علامہ ندوی کا یہ نظریہ کہ وہ اصلاح بین الناس اور اختلاف امت کو دور کرنے کے لیے نکلی تھیں شکست ہوجاتا ہے، اگر سید ندوی کا یہ مزعومہ قبول کرلیا جائے کہ اس عوامی زندگی کے ہتم بالشان معاملہ پر انھیں قطعی کوئی تأسف نہ تھا۔" (مجموعۂ مقالات ص ۵۹)

اس سے پہلے یہ وضاحت کی جاچکی ہے کہ حضرت عائشہؓ کو دعوت اصلاح پر قطعی کوئی تأسف نہ تھا، بلکہ وہ صرف اس طریقۂ اصلاح کو اپنی اجتہادی غلطی سمجھتی تھیں جو انھوں نے اس دعوت کیلئے اختیار کیا تھا، اسی وجہ سے سید صاحبؒ لکھتے ہیں "حضرت عائشہؓ کو اپنی اس اجتہادی غلطی پر... عمر بھر افسوس رہا، (سیرت عائشہ ص ۱۴۳)

مگر مولانا اکبرآبادی مرحوم نے اصلاح اور طریقۂ اصلاح کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا جو سید صاحبؒ نے تحریر فرمایا تھا، اس لیے انھیں یہ اشتباہ ہوگیا۔

مطبوعات جدیدہ

مشکلات الاحادیث النبویہ: مرتبہ عبداللہ بن علی النجدی القصیمی، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۲۱۲، قیمت درج نہیں، پتہ المجلس العلمی السلفی شیش محل روڈ، لاہور پاکستان۔

اس عربی کتاب میں ان مشکل احادیث کی شرح و توضیح کی گئی ہے، جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قرآن مجید اور دین کے اصول و مقاصد کے مطابق نہیں ہیں، اور عقل نیز موجودہ علمی، طبی، جغرافیائی اور فلکیاتی تحقیقات کے خلاف ہیں، فاضل مصنف نے پہلے اصل مآخذ سے حدیثیں نقل کر کے ان کی صحت و قوت بتائی ہے، پھر ان کے بارہ میں معترضین اور منکرین حدیث کے شکوک و شبہات تحریر کر کے ان کا جواب دیا ہے، مصنف نے بعض ایسی حدیثوں کا صحیح مفہوم و مطلب بھی بیان کیا ہے، جن کو بعض گمراہ فرقے اور اہل بدعت اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں، اور ان کے غلط معنی بیان کرتے ہیں، اس کتاب میں مختلف احادیث پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، جن میں عذاب قبر، معجزۂ شق القمر، یہودی کے آپ کو سحر کرنے، دجال، حضرت آدمؑ و موسیٰؑ کا محاجہ، ملک الموت کو حضرت موسیٰؑ کے طمانچہ مارنے، حضرت ابراہیمؑ کے تین دفعہ جھوٹ کہنے، قرآن مجید کی منسوخ التلاوت آیتوں کے احکام کے باقی ہونے، معراج اور مردوں سے آپؐ کے خطاب کرنے وغیرہ کی حدیثیں زیادہ اہم اور نازک ہیں، یہ کتاب نیک جذبہ اور منکرین حدیث کے اشکالات کو رفع کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس لحاظ سے قابل قدر ہے، لیکن مصنف کے بعض جوابات تشفی بخش نہیں ہیں، خصوصاً منسوخ التلاوت آیتوں کے حکم کے باقی رہنے، اور حضرت ابراہیمؑ کے تین بار جھوٹ بولنے وغیرہ کی روایات کی جو توجیہ

کی گئی ہے، اس سے بعض اصحاب علم و نظر اور محققین نے بھی اتفاق نہیں کیا ہے۔

اسلام اور بدلتی دنیا:۔ از جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۸ مجلد، قیمت ۲۱ روپے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵۔

ملک کے مشہور مصنف و دانشور ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم نے ۱۹۶۹ء میں "اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی" قائم کر کے اس کی طرف سے انگریزی اور اردو میں "اسلام اور عصر جدید" کے نام سے سہ ماہی علمی رسالے نکالے تھے، ان میں بلند پایہ علمی مضامین کے ساتھ ہی مسلمانوں اور دنیائے اسلام کے موجودہ حالات و مسائل پر بھی اظہار خیال کیا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد جامعہ ملیہ کے مشہور صاحبِ قلم جناب ضیاء الحسن فاروقی کو دونوں رسالوں کی ادارت سپرد کی گئی اور وہ اب تک اسے خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں، گذشتہ چند برسوں میں اردو رسالہ میں ان کے قلم سے جو اداریے شائع ہوئے تھے، زیر نظر کتاب ان کا مجموعہ ہے، اس میں عالم اسلام کے واقعات اور مسلمانوں کو درپیش دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل کے نتائج و عواقب کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عقل و تدبر سے کام لیکر ان کو حل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، مجموعہ کی ابتدا جامعہ ملیہ کے معمار اور اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم کے ذکر خیر سے ہوئی ہے، اس میں جامعہ، اردو زبان اور ملک و ملت کی تعمیر و ترقی کے لئے ان کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ کیا ہے، اور اسی ضمن میں ان کی ان کوششوں کا جائزہ بھی لیا ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کے ذہنی جمود و افسردگی اور ملک کے بحران کو دور کرنے کیلئے انھوں نے کی تھیں، اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی کا قیام بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس کے اور اس کے سہ ماہی رسالوں کے مقاصد و خدمات تفصیل سے قلمبند کئے ہیں، اسی نوعیت کے ایک مضمون میں جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے علمی، فکری اور دعوتی

کارناموں کا جائزہ لے کر ان کے مفید پہلوؤں اور دور رس اثرات کا ذکر کیا ہے، مگر آخر میں ان کے بعض فکری و دینی خیالات کی کوتاہیوں کی نشاندہی بھی کی ہے، ایک مضمون میں دکھایا ہے کہ اسوقت دنیائے اسلام کے بعض ملکوں میں اسلامی بیداری کے آثار اور اسلام کو مضبوط و مستحکم کرنے کی خواہش تو نمایاں ہے، مگر ان میں معاشرتی و معاشی اصلاح اور سچی اسلامی زندگی کے قیام کے بنیادی کام کو نظر انداز کر کے سیاسی طاقت اور حکومتی اقتدار حاصل کر کے اسلامی قوانین کو نافذ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، اسی غفلت و کوتاہی کا ذکر "اصلاح و تجدد کے حامی اور ان کی الجھنیں" میں بھی کیا ہے، اس میں جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سرسید اور اقبال کی اصلاحی و مذہبی کوششوں کی خوبیاں اور خامیاں بھی زیر بحث آگئی ہیں، مصنف کے خیال میں اس وقت مسلم معاشرہ قدیم و جدید کی کشمکش کی وجہ سے ذہنی و فکری انتشار میں مبتلا ہے، اس لئے موثر و معقول تجدد پسندی معدوم ہو گئی ہے، اور کتاب و سنت کا نام لینے کے باوجود مغربیت چھائی جارہی ہے، ایک مضمون پندرہویں صدی ہجری کی مناسبت سے لکھا گیا ہے، اس میں چودہویں صدی کا جائزہ لیکر اسلام اور مسلمانوں کی شکست و ریخت کے یہ افسوسناک واقعات زیر بحث آئے ہیں، مغرب کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی بالادستی اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے بوسیدہ اور محدود مادی وسائل، مسلمانوں اور ان کے ملکوں کی مغرب کی محکومی، اسلامی تعلیمات کو مشنریوں اور مستشرقین کا مسخ کرنا، مغربی تہذیب کے تضاد اور پسپائی کے باوجود سائنس اور ٹکنالوجی میں اس کی برتری، اسرائیل کا قیام، اسلامی ملکوں میں پٹرول کے ذخیرہ کا انکشاف مگر دولت کی فراوانی کا عذاب بن جانا، افغانستان میں روسی فوجوں کا داخلہ وغیرہ، مضمون کا خاتمہ اس عزم و حوصلہ کی دعوت پر کیا ہے، کہ چودہویں صدی ہجری کے رہنماؤں کی شاندار فکری و عملی کوششوں کی وجہ سے اسلامی بیداری کی جو لہر وجود میں آئی ہے، اس کو ضائع کرنے کے بجائے اس کی بنیاد پر اپنی اور نوع انسانی کی اصلاح کے اولوالعزمانہ

کام سے پندرہویں صدی ہجری کا استقبال کیا جائے، دارالمصنفین کے اسلام اور مستشرقین پر بین الاقوامی سمینار اور ہمدرد نگر کی بین الاقوامی قرآن کانگریس پر بھی مفید مضامین ہیں، اسلام اور مغرب اور اسلامی فنڈامنٹلزم، مسلمانوں کی اخلاقی حالت یونیفکیشن چرچ اور عربوں کا عروج و زوال بھی مفید اور معلومات سے پُر مضامین ہیں، ایک اداریہ میں سیوکلرازم کے بارہ میں مسلم معاشرہ کے ردعمل، اسلامی دنیا میں اس کے نفوذ، مسلمانوں پر اس کے اثرات اور اس سے پیدا ہونے والی کشمکش اور بے چینی دکھائی ہے، آخری مضمون میں یتیم پوتے کے حق وراثت کے بارے میں موجودہ علما کے دو مختلف نظریوں کا ذکر کرکے بعض مفید باتوں کی جانب توجہ دلائی ہے اور علما و مفکرین کو اس کی دعوت دی ہے کہ اس کا کوئی متفقہ اور معقول حل تلاش کریں، لائق مصنف کی نظر حالات کی نزاکتوں اور دین کے تقاضوں پر یکساں ہے، ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد اور یہ نیک جذبہ بھی ہے کہ موجودہ مسابقت میں مسلمان کسی سے پیچھے نہ رہیں، اس لیے انھوں نے جام شریعت اور سندان عشق دونوں کا حق ادا کیا ہے، ان مضامین میں فکری گہرائی، اور اصلاحی و علمی دعوت کے علاوہ مصنف کا سوز و ساز اور درد و داغ و جستجوئے آرزو بھی شامل ہے، ان کے یہ سنجیدہ و متوازن خیالات غور و فکر کے مستحق ہیں،

جامعہ مجیب نمبر:- مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۴۳، قیمت ۳۵ روپیے، سالانہ چندہ ۱۵ روپیے پتہ جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے تین معماروں میں ایک پروفیسر محمد مجیب مرحوم بھی تھے، جو تقریباً نصف صدی تک اس سے وابستہ رہے، اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد وہ شیخ الجامعہ مقرر کئے گئے، انہی کے دور میں جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ ملا،

مجیب صاحب شرفائے اودھ کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور خود بھی بڑے لائق و فاضل تھے اس لئے انھوں نے علم و ادب کی بھی مفید خدمت انجام دی ہے، اور جامعہ کی تعمیر و ترقی اور توسیع میں بھی ان کا بہت نمایاں اور شاندار حصہ رہا ہے، اب ماہنامہ جامعہ نے ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے، جو ان کے گوناگوں کمالات و کارناموں کا مرقع اور متنوع مضامین کا اچھا مجموعہ ہے، شروع کا حصہ مختلف موقعوں کی مجیب صاحب کی تصویروں سے مزین ہے، اس کے بعد ان کی شخصیت، سیرت اور کمالات کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین درج ہیں، یہ سب مضامین ان لوگوں کے قلم سے ہیں، جن کو برسوں مجیب صاحب کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا موقع ملا یا جن کو ان سے فخر تلمذ حاصل تھا، یہ مضامین مختلف نوعیت کے ہیں، پہلا مضمون مجیب صاحب کے خود نوشت حالات پر مشتمل ہے، دوسرے مضامین میں ان کے حالات زندگی، اخلاق و سیرت کے جلوے، شخصیت و مزاج کے خط و خال اور دوسری خوبیاں اور خصوصیات نمایاں کی گئی ہیں، بعض مضامین میں ان کی تصنیفات و نگارشات پر بحث و تبصرہ کیا گیا ہے، ان میں ان کے فنی کمالات، افکار و خیالات اور اسلوب و طرز نگارش کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، دوسرا حصہ خود مجیب صاحب کی تحریروں اور مضامین پر مشتمل اور اہم ہے، ان سے بھی مجیب صاحب کی زندگی، اور طریقہ غور و فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، یہ نمبر اہتمام اور سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے جو اچھے اور معیاری مضامین پر مشتمل ہونے اور مجیب صاحب کی زندگی اور انکے عملی، علمی و تعلیمی خدمات اور کارناموں کا مرقع ہونے کی وجہ سے مطالعہ کے قابل ہے،

انجمن اسلام کے سو سال:- مرتبہ جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۳۶، قیمت ۲۵ روپے۔ پتہ۔ انجمن اسلام بدرالدین طیب جی مارگ، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱۔

انجمن اسلام بمبئی کے مسلمانوں کا مشہور اور عظیم الشان تعلیمی و ثقافتی ادارہ ہے، جو بڑی خوش انتظامی سے مسلمانوں کی ترقی و بہبودی کی قابل فخر خدمات انجام دے رہا ہے، ۱۹۷۴ء میں اس کے قیام کو سو برس ہو گئے، اس مناسبت سے اس کے صد سالہ جشن منانے کا مسئلہ زیر غور آیا تو اس کی گذشتہ پُرعظمت تاریخ مرتب کئے جانے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی، اس کے لیے جشن صدی کمیٹی کی نظرِ انتخاب جناب سید شہاب الدین پر پڑی، جو ہر اعتبار سے اس کے بڑے اہل تھے، وہ تقریباً نصف صدی تک مختلف حیثیتوں سے انجمن سے وابستہ رہے اور انھیں اس طرح کے کاموں کو انجام دینے کا خاص تجربہ اور بڑی مہارت ہے، اس بنا پر انھوں نے یہ تاریخ بڑی محنت اور سلیقہ سے دو حصوں میں مرتب کی ہے، پہلے حصہ میں انجمن کے گذشتہ پانچ دور کی سرگرمیوں اور کارگذاریوں کی مکمل تفصیل قلمبند کی گئی ہے، اور دوسرے حصہ میں اس کے وسیع اور اہم کاموں کا جائزہ لیکر ان پر حسب ضرورت مناسب انداز میں اظہار خیال کیا ہے، پہلے حصہ میں انجمن اسلام کا پس منظر، اس کی تشکیل، مقاصد، انجمن اسلام ہائی اسکول کے قیام اور ثقافتی و سماجی سرگرمیوں کی رُوداد تحریر کی ہے، اس کے بعد ہر دور میں اس کے کاموں میں جو وسعت و ترقی ہوئی، اور مختلف شعبے اور اسکول قائم ہوئے، جو سماجی اصلاحی اور تعمیری کام انجام پائے، دستور و مقاصد میں جو رد و بدل ہوا، اور جو لوگ انجمن کے کاموں میں پیش پیش رہے، ان سب کا تذکرہ ہے، دوسرے حصہ میں ادارہ کی گوناگوں تعلیمی، ادبی، لسانی، دینی، ملی اور فلاحی اسکیموں کا جائزہ لیا ہے، جن میں تعلیم نسواں اور دینی تعلیم کے فروغ، ابتدائی و ثانوی سطح پر جدید تعلیم کے رواج، اردو زبان کی ترقی اور اوقاف کی اصلاح وغیرہ کا ذکر ہے، اس کے بعد انجمن کی اہم تقریبات کی داستان اور اس کے ممتاز معماروں کا حال بیان کیا ہے، آخر میں کئی ضمیمے ہیں، جن میں انجمن کے قواعد و ضوابط، خطوط، سپاس نامے، طلبہ و طالبات کے اسکولوں کے نام، ان کے اساتذہ و طلبہ کی تعداد، یتیم خانوں،

فنڈ، چیئرمین، اسٹاف، صدر، سکریٹری، اور مختلف اسکولوں کو بڑے بڑے چندے دینے والوں کے نام دیے ہیں، فاضل مرتب نے اس کو دلچسپ اتفاق قرار دیا ہے کہ انجمن اسلام کے قیام کے قریب زمانے ہی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور انڈین نیشنل کانگریس بھی وجود میں آئی مگر سر سید کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کے مخالف رہے، اور انھوں نے اس سلسلہ میں مسلمانوں کی تمام انجمنوں کو مراسلہ بھی لکھا جو ایک ضمیمہ میں درج ہے، جب کہ بدر الدین طیب جی اور ان کے رفقاء کانگریس کے حامی تھے اور مسلمانوں کے عام فلاح و بہبود اور سیاسی حقوق کے حصول کے لیے اس میں ان کی شرکت کو موزوں خیال کرتے تھے، مرتب نے سیاست سے انجمن کا تعلق بھی دکھایا ہے مگر یہ لکھا ہے کہ بتدریج اس نے سیاست کے سوا دوسرے مقاصد کو مرکز توجہ بنا لیا، انجمنِ اسلام کی یہ تاریخ دوسری انجمنوں اور اداروں کے لیے سبق آموز ہے، ایجاز، سلاست و شگفتگی مرتب کی تحریر کی خاص خوبی ہے، جس کا نمونہ یہ کتاب بھی ہے،

کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور ان کی مطبوعات، مرتبہ جناب سید عقیت الحسن صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۲۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ ر روپیے، پتہ عثمانیہ بک ڈپو ۱۲۴/۲ لور چیت پور روڈ (نا بند سرانی) کلکتہ ۷۳

جناب سید عقیت الحسن صاحب عرصہ سے نیشنل لائبریری کلکتہ سے وابستہ ہیں، اور اب وہ اس کے ڈپٹی لائبریرین ہیں، اس لیے کتابیں اور کتبخانے ان کی دلچسپی و توجہ کا خاص مرکز ہیں، اور وہ کتابوں کی طبع و اشاعت کے مسائل اور پریس کے امور سے بھی واقف ہیں، ان صفحات میں ان کی کتاب لائبریرین شپ کا پہلے ذکر آچکا ہے، زیر نظر کتاب میں انھوں نے کلکتہ کے قدیم اور اولین دور کے مطبعوں، ان سے شائع ہونے والی کتابوں اور ان کے مالکوں کے بارہ میں مفید معلومات فراہم کئے ہیں، ایک زمانہ میں علمی و سیاسی حیثیت سے کلکتہ ہندوستان کا زیادہ اہم اور ممتاز شہر رہا ہے،

اس لئے صنعتی اور سائنسی ترقی کے لحاظ سے بھی یہ بہت نمایاں تھا، چنانچہ عربی و فارسی رسم الخط میں ٹائپ کی ایجاد میں اولیت کا سہرا اسی کو حاصل ہے، جس کے نتیجہ میں متعدد معیاری پریس بھی یہاں قائم ہوئے اور سیکڑوں کتابیں شائع ہوئیں، مگر اب امتداد زمانہ کی وجہ سے نہ لوگ ان مطابع سے واقف ہیں، اور نہ انکی اشاعتی خدمات سے، اس لئے لائق مصنف نے ابتدا سے انیسویں صدی تک کے کلکتہ کے ممتاز اور اہم مطابع کا یہ تذکرہ مرتب کیا ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ مطابع کے ذکر کے لیے خاص ہے، اس میں ہر پریس کے آغاز و قیام، ان کے مالکوں، ان کی مطبوعات اور مولفین کا نام دیا ہے اور معیار طباعت اور کتابوں کی بعض خصوصیات بھی تحریر کی ہیں، دوسرے حصہ میں ان اشخاص اور اداروں کا حال قلبند کیا ہے، جن کا ذکر پہلے حصہ میں آیا ہے، اور وہ پریس سے وابستہ یا کتابوں کی طبع و اشاعت میں شریک رہے ہیں، تیسرے حصہ میں کلکتہ سے ۱۸۰۱ء سے ۱۹۰۰ء تک شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست دی ہے، اس میں مطبع مصنفین اور کتابوں کے نام، انکے سنہ اشاعت صفحات کی تعداد، طباعت کی نوعیت اور بعض کے موضوع کی بھی صراحت کی ہے، آخر میں مفصل انڈکس بھی ہے یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی گئی ہے، اور اردو میں اپنی نوعیت کی انوکھی ہے، لیکن غالباً مصنف پر انگریزی زبان کا ذوق و اثر غالب ہے، اس لئے کہیں کہیں بلا ضرورت انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں،

آدابِ ازدواج : مرتبہ مولانا ابو اجود محمد الاعظمی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۴۰، قیمت ۲ روپیہ ۵۰ پیسے پتہ ادارہ تحقیقات و نشریات اسلامی مدرسہ عالیہ عربیہ مئو ناتھ بھنجن، یو۔ پی

اس کتاب میں اسلام میں شادی بیاہ کے شرعی آداب و طریقے بیان کئے گئے ہیں، اور ازدواج کی دینی اہمیت، نکاح، مہر، زفاف و ولیمہ، زوجین میں حسن معاشرت اور ان کے حقوق و افزائش نسل وغیرہ کے متعلق اسلامی تعلیم و ہدایت پیش کی گئی ہے، مصنف نے غلط رسم و رواج کی سخت مذمت بھی بیان کی ہے، یہ کتاب مفید ہے۔

"ض"

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت ۵۵/=

۲۔ سیرۃ النبیؐ جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ ۵۵/=

۳۔ سیرۃ النبیؐ جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔ ۲۵/=

۴۔ سیرۃ النبیؐ جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ ۵۵/=

۵۔ سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ ۲۰/=

۶۔ رحمت عالمؐ۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۶/=

۷۔ خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ ۱۳/=

۸۔ سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔ ۲۲/=

۹۔ حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ ۵۵/=

۱۰۔ ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔ ۲۱/=

۱۱۔ ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ ۱۵/=

۱۲۔ خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ ۴۰/=

۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ ۱۴/=

۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۴۶/=

۱۵۔ نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی) ۳۹/=

۱۶۔ یاد رفتگان۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات ۳۰/=

۱۷۔ مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ ۳۰/=

۱۸۔ مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ ۲۶/=

۱۹۔ مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) ۲۶/=

۲۰۔ برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔ ۱۷/=

۲۱۔ دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ۳/= ۵/=

"منیجر"